جو کتب خانہ کی تاریخ اور اس کے نوادر و مخطوطات کے علاوہ ریاست کے دوسرے کتب خانوں کے بارہ میں مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین خود فاضل مرتب اور ٹونک کے ایک دوسرے فاضل مولوی حکیم محمد عمران خاں صاحب کے قلم سے ہیں، اور پہلے معارف وغیرہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان سے ٹونک اور راجستھان کے متعدد کتب خانوں اور ان کے اہم مخطوطات کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس طرح یہ مجموعہ علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے، لیکن فاضل مرتب کے مضامین میں عموماً کتابوں کے مصنفین کے سنین وفات کا ذکر نہیں ہے اور بعض کتابوں کے مندرجات کا خلاصہ بھی نہیں دیا گیا ہے، حالانکہ ان کے بغیر مخطوطات کے تعارف میں کمی رہ جاتی ہے، وہ ایک جگہ مشہور مورخ اور سیاح مسعودی کے متعلق لکھتے ہیں، "ہندوستان آنا تو یہاں کی کتب سے بھی ثابت ہوتا ہے، آخر عمر میں یہیں قیام پذیر ہوگئے تھے (ص ۱۴۵) یہ درست نہیں ہے آخر عمر میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور فسطاط میں انتقال ہوا جیسا کہ خود مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے، قصائد حسن غزنوی کے ایک نسخہ کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اول صفحہ پر ایک مہر مختار خان حسینی سبزواری کی ثبت ہے، جو شاہجہانی امرا میں سے تھے اسی لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ شاہجہانی دور سے قبل کا ہے (ص ۵۰) حالانکہ شاہجہانی امیر کی مہر ثبت ہونے کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی دور کا ہے نہ کہ اس سے قبل کا جیسا کہ خود انھوں نے بھی ص ۴۹ پر یہی لکھا ہے "شاہجہاں کے عہد زریں کی یادگار ہے" ص ۵ پر مرآت آفتاب نما کو مرآت آفتاب نامہ لکھا ہے،

مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی:- مرتبہ جناب مولوی عبد الرحمن ناصر صاحب اصلاحی جامعی تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۸۰ قیمت للعہ پیسے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ (۲) کاشانۂ ناصر، سیدھا سلطان پور، بینا پارہ۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی۔

یہ اردو کے جوان مرگ ادیب و نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کی طالب علمی کے زمانہ کے چند خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے ایک عزیز ہم وطن مولوی عبد الرحمن ناصر اصلاحی کو لکھے تھے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی طرح ان سے اس ادبی و علمی ذوق اور شوق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے جو مکتوب نگار کو شروع ہی سے تھا، یہ سب خطوط بے تکلفی سے لکھے گئے تھے اسلئے ان میں بے ساختگی ہے اور ان سے خلیل مرحوم پر کام کرنے والوں کو مدد ملے گی، مکتوب الیہ مرتب نے شروع میں مرحوم کے مختصر حالات اور خطوط پر توضیحی حاشیے بھی لکھے ہیں جو ان کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہیں۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

معارف کی گذشتہ اشاعت میں رومن امپائر اور یورپ کی عیسائی حکومتوں میں جو غدار پیدا ہوتے رہے، ان کا ذکر آیا تھا، قدیم ہندوستان کے ایسے غداروں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے،

قدیم ہندوستان کی سیاست پر ایک مستند اور اہم کتاب ارتھ شاستر ہے، اسکو چندرگپت موریا کے زیرک اور تیز فہم وزیر چانکیا نے لکھا، اس میں خاندان موریا کے قبل کے راجاؤں نے اپنی حکمرانی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ معاصر راجاؤں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے، ان میں تنازع للبقاء ہمیشہ جاری رہا، زبردست کا بول بالا رہتا، کوئی راجا کسی دوسرے راجہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی بھروسہ نہ کرتا، وہ معاہدہ کو اپنی طاقت کے بڑھ جانے سے بلا پس وپیش توڑ دیتا، زیادہ طاقتور ہو جاتا تو دوسرے پر فوج کشی کر دیتا، اخلاق و مروت کو سیاست میں جگہ نہیں دیجاتی، کھلم کھلا عیاری اور دغابازی کے وسائل اور ذرائع اختیار کئے جاتے، جن میں چھپ کر قتل کرنا بھی شامل تھا، راجہ اپنے خاندان کے اراکین سے ہمیشہ ڈرتا رہتا تھا، حکومت کی خاطر باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے دشمنی رکھتا، منظم جاسوسی پر حکومت کا انحصار ہوتا، فاحشہ عورتیں اس کام میں زیادہ مشاق سمجھی جاتیں،

چانکیا نے موریا خاندان کے مشہور راجہ چندرگپت موریا کو اسی قسم کی تعلیم دی، اس نے اس پر عمل کرنے میں اس لئے پس وپیش نہیں کیا کہ وہ اپنے میں بہت سی خامیاں پاتا تھا، وہ

مگدھ کے ایک شاہی خاندان سے ضرور تھا، مگر اس کی ماں یا نانی ایک نیچ ذات کی عورت تھی، اس وجہ کر وہ اپنے کو ذلیل محسوس کرتا تھا، اس کے اوائل زندگی میں مہاپدنند ایک نائی نے مگدھ کے راجہ کی رانی سے ناجائز تعلقات پیدا کر لئے، تو اس نے رانی سے مل کر راجہ کو قتل کر دیا، اور خود گدی پر بیٹھ گیا، چندرگپت کو اس نے اپنی راہ کا روڑا سمجھ کر جلاوطن کر دیا، اس زمانہ میں سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، چندرگپت نے اس سے مل کر مگدھ پر حملہ کرنے کی دعوت دی، مگر سکندر یہاں تک نہیں پہونچ سکا، مہاپدنند کے بعد اس کا ایک بدچلن بیٹا نندگدی پر بیٹھا لوگ اس سے خوش نہ تھے، چندرگپت نے اس کے خلاف لشکر کشی کر کے اس کو قتل کر ڈالا، اور گدی کا مالک بن بیٹھا،

چندرگپت نے اپنے حامیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، ان کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آیا، مگر اس کے ظلم کو لوگ اس لئے بھول گئے کہ اس نے اپنی فتوحات سے اپنی حکومت کا دائرہ خلیج بنگال سے لے کر بحیرۂ عرب تک پھیلا دیا تھا، اپنی غیر معمولی کامیابی کے باوجود وہ اپنی جان کو ہمیشہ خطرے میں محسوس کرتا، وہ دن کے وقت سونے یا دو راتوں کو مسلسل ایک ہی کمرے میں گذارنے کو اپنے لئے خطرناک سمجھتا، اس کے مخبر ان سازشی لوگوں کی کھوج لگایا کرتے جو ان راستوں میں چھپتے رہتے تھے، جو چندرگپت کی خوابگاہ تک جاتے تاکہ رات کے وقت اس میں داخل ہو کر اسکو قتل کر دیں،

اس کا جانشین اس کا بیٹا بندوسارا گدی پر بیٹھا، جو متراگھاٹ یعنی دشمن کش کے لقب سے مشہور ہوا، اس کا جانشین اشوک ہوا، جس کی پارسائی اور حکمرانی کی دھوم ہے، اس کے متعلق ایک روایت ہے کہ اس کے سو بھائی تھے، ان میں سے وہ ننانوے کو قتل کر کے گدی پر بیٹھا، گو موجودہ تحقیق سے اس کی تردید کی جاتی ہے، وہ خاندانی طور پر کم نسل تھا، برہمن کم نسلوں کو خاطر میں نہیں لاتے، شاید اسی لیے وہ ہندوازم اور برہمنزم سے علحدہ ہو کر

بودھ مت کی طرف مائل ہوگیا، اپنی مساعی جمیلہ سے اسکو ایک عالمگیر مذہب بنادیا جس سے اس کی شہرت اور بڑھی، مگر معلوم نہیں اس نے بڑھاپے میں کس مصلحت سے ایک بدچلن عورت تشیارکشتا سے شادی کرلی، جس نے اس کے لڑکے سے بھی ناجائز تعلقات پیدا کرلیے، اس کے وزراء اس سے آخر میں کچھ ایسے آزردہ ہوئے کہ اس کے سارے اختیارات بالکل سلب کرلئے اور اس کی جگہ اس کے پوتے سامپرتی کو گدی پر بیٹھایا، اور وہ گمنامی میں کہیں مرگیا،

اس کی زندگی ہی میں اس کے ایک بیٹے جلوک نے بودھ مت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، وہ کشمیر کا راجہ بن کر شیو کی پوجا کیا کرتا تھا، اشوک کا جانشین سمپرتی جین مذہب کا مربی ہوگیا، پھر برہمن بھی کھل کر سامنے آگئے، اور بودھ مت کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرنے میں لگ گئے، اس افراتفری میں اشوک کی شاندار سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اس کے آخری راجہ کو اس خاندان کا ایک فوجی سردار پشی متر قتل کرکے خود راج کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے سنگ خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔

پشی متر نے نہ صرف ہندو مت کا احیاء بلکہ بودھ مت کی ساری خانقاہوں کو جلاکر خاکستر کیا، مگدھ سے جالندھر تک جو بھی بدھ راہب تھے، ان کو بے دریغ قتل کیا، بودھ مت کے خلاف ہندو راجاؤں اور برہمنوں کی ایذا رسانی روز بروز اتنی بڑھتی گئی کہ جہاں سے یہ مذہب نکلا تھا وہاں سے بالکل دربدر ہوگیا۔

سنگ خاندان کی حکومت میں زیادہ تر فتنہ و فساد رہا، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے ایک راجہ اگنی متر کا ایک چہیتا بیٹا اس کے سامنے ایک ناٹک دیکھ رہا تھا، تو ایک شخص متر دیو نے اس کا سر تلوار کے وار سے اس طرح الگ کردیا، جس طرح کنول کو اس کی ڈالی سے کیا جاتا ہے، اسی خاندان کے آخری بدچلن اور شرابی راجہ دیو بھوتی کو اس کے ایک برہمن وزیر بسرد یو نے

قتل کردیا، اور گدی کا مالک بن بیٹھا، اور اس سے کنو خاندان کی حکومت چلی، اس خاندان کے آخری راجہ سسرمن کو دکن کے خاندان اندھریا سات داس کے راجہ نے ہلاک کیا، اندھر خاندان کو کشان خاندان کے راجہ کنشک نے ختم کیا، جو بہت ہی جلیل القدر فرمانروا گذرا ہے، کشان وسط ایشیا کے ایک خانہ بدوش قبیلے سے تھے، مگر وہاں سے آکر ہندوستان کے فرمانروا ہوگئے،

کنشک نے ہندوستان کے بہت سے علاقے اپنے زیرنگیں کئے، مگر وہ تو چاہتا تھا کہ جہات اربعہ پر حکمرانی کرے، مگر اس کی لڑائیوں سے اس کی رعایا اس سے بے حد برگشتہ ہوگئی اسکو حریص اور سفاک سمجھنے لگی، جب وہ بیمار پڑا تو اس کو ایک رضائی اڑھادی گئی، اور اس کے اوپر ایک شخص بیٹھ گیا، جس کے بعد اس نے دہین کی وہین جان دیدی، کنشک کی وجہ سے بودھ مت کو پھر فروغ ہونے لگا تھا،

کشان خاندان کے بعد گپت خاندان کی حکومت شروع ہوئی، تو برہمنی ہندومت کا پھر سے احیاء ہونے لگا، اسی خاندان کا ایک رکن راجہ سانگ بنگال کا حکمران تھا، اس نے ہرشن وردھن کے بھائی کو دغا بازی سے قتل کردیا، اس کو بدھ مذہب سے بھی بڑی نفرت تھی، اس کی بیخ کنی کے لئے برابر تلا رہتا، بودھ گیا کے مقدس بودھی درخت کو اکھاڑ کر جلوادیا، جس کے نیچے راجہ اشوک نے بے انتہا عبادتیں کی تھیں، اس نے پاٹلی پتر میں اس پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کرادیا جس پر بودھ کے قدم کے نشان بنے ہوئے تھے، تمام خانقاہوں کو برباد کر ڈالا بھکشوؤں کو اپنی مملکت کے حدود سے جلاوطن کرادیا۔

ہرشن وردھن ہندوستان کے نامور حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر جب وہ بودھ مذہب کی طرف مائل ہونے لگا تو برہمنوں نے اس کو قتل کردینے کی سازش کی، اس نے قنوج کے پاس گنگا کے کنارے . . . . ہیون سانگ چینی کی تعلیمات کی ترویج کے لیے ایک شاندار خانقاہ

بنوائی، مگر برہمنوں نے آگ لگا کر اس کو برباد کر دیا، پھر ایک شخص نے اپنے خنجر سے اس پر قاتلانہ حملہ کیا، لیکن وہ ناکام رہا، اس نے اقبال جرم کے سلسلہ میں انکشاف کیا کہ برہمنوں نے اس کو اس کام کے لئے بھیجا تھا، اس کے بعد سرغنوں کو سزائے موت دی گئی، اور تقریباً پانچ سو برہمنوں کو جلاوطن کر دیا گیا،

راجاؤں کی باہمی نفاق پروری اور دشمنی کی وجہ سے ہندوستان بیرونی حملہ آوروں کی ایک جنت بنا ہوا تھا، پورا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوتا رہا، انکے حکمران ایک دوسرے سے ہمیشہ دست و گریبان رہتے، کوئی راجہ اپنی اولوالعزمی اور سپہگری سے ان منتشر علاقوں کو ایک لڑی میں پرو لینے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ ملک ایک معلوم ہوتا، ورنہ پھر علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بٹ جاتا، اس افراتفری کی وجہ سے یونانی یہاں آئے تو پنجاب اور اسکے آس پاس کے علاقوں پر ان کا تسلط تقریباً دو سو (۲۰۰) برس تک رہا، اسی طرح پارتھی، خوارزم، سمرقند اور ہرات کے بے آب و گیاہ علاقے سے ہندوستان آئے، تو انھوں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی، پھر باختر کا خانہ بدوش قبیلہ پہاڑی دروں کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا، تو ٹکسلا اور جمنا کے کنارے متھرا میں اپنی بستیاں بسائیں، اور ایک صدی سے زیادہ تک پارتھیوں کے ماتحت حکمراں رہے، اسی طرح سینتھی اور سکائی قبیلوں کے لوگ جو دریائے جیحون کے شمال میں رہتے تھے، یہاں آکر بڑے ٹھاٹھ سے قابض رہے، کشان بھی خانہ بدوش تھے، وہ وسط ایشیا سے آئے تو انھوں نے یونانیوں، پارتھیوں اور سینتھوں کا قلع قمع کر دیا، مگر پھر وہ خود گپت خاندان سے مغلوب ہو گئے۔

ہندوؤں کو اس نفاق پروری سے عبرت حاصل کرنا چاہئے تھا، مگر انکی انتشار پسندی جاری رہی، راجستھان راجپوتوں کا بڑا مرکز تھا، مگر کبھی یہ ایک راجہ کے زیر نگیں نہیں رہا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا، پھر خود ان ریاستوں میں بڑی ریشہ دوانیاں رہیں، مثلاً میواڑ کے راجپوتوں کی

تاریخ بہت ہی ولولہ انگیز طریقے سے بیان کی جاتی ہے، مگر اسی کے راجہ لکھا رانا نے مارواڑ کی ایک ایسی راجکماری سے خود شادی کر لی جس کی اس کے لڑکے چندر سے طے ہونے والی تھی، اور جب اس سے ایک بچہ موکل جی پیدا ہوا تو اسی کو چندا کے بجائے اپنا جانشین بنایا، پھر تو شدید جنگ ہوئی جس میں موکل جی کا قتل ہوا، اسی خاندان کے راجہ کمبھو کو اس کے لڑکے نے قتل کیا، مگر کمبھو کے لڑکے کو رائےمل نے بے دخل کیا، اور خود راجہ بن بیٹھا، رانا رتنا کے جانشین بکرماجیت کو قتل کر کے ایک مجہول النسب راجپوت بن بیر راجہ بن بیٹھا، اس نے رانا سانگا کے ایک نوزائیدہ بچہ کو قتل کرنا چاہا، وہ روپوش کر دیا گیا، جس سے خانہ جنگی جاری رہی، بن بیر معزول کیا گیا، اسی خاندان کا رانا پرتاب سنگھ جب اکبر سے لڑا تو اسکا بھائی اکبر کی حمایت میں لڑا، ایسے اختلافات سے راجپوتوں کی تاریخ بھری ہوئی ہے،

بعض راجپوت راجہ تعداد ازدواج کی وجہ سے بڑے کثیر العیال ہوتے، اشوک کے سو (۱۰۰) بھائی بتائے جاتے ہیں، راجہ مان سنگھ کچھواہہ کی پندرہ سو (۱۵۰۰) بیویاں تھیں، ان راجاؤں کا بڑا لڑکا تو قانونی طور پر گدی پر بیٹھ جاتا اور لڑکے اقتدار اور جاگیر کی ہوس میں چھوٹے چھوٹے قلعے، گڑھ، اور گڑھی بنا کر اپنے علاقے کے حکمراں ہو جاتے، اور جب تھوڑی طاقت حاصل کر لیتے تو ارتھ شاستر کے اصول پر اپنے کمزور ہمسایہ راجا پر حملہ آور ہو جاتے، پھر ان راجپوتوں کی بہت سی قسمیں ہو گئیں، راٹھور، سیسودیہ، کچھواہہ، ہاڈا، گوڑ، چوہان، شیخاوت، بندیلہ، چندراوت وغیرہ وہ آپس میں اس طرح لڑتے رہے کہ بقول جدوناتھ سرکار جاگیر کی خاطر بیٹا باپ سے برسرپیکار ہوا، بھائی اپنے سگے بھائی سے محاذ آرا ہوا، داماد نے خسر کو چھوڑا، اپنے ہم مذہبوں اور ہم قبیلوں سے لڑنے میں ندامت محسوس نہیں کی، ضرورت ہوئی تو پھر تو اہم فوجی قلعے اور مورچے بھی مسلمان بادشاہوں کے حوالے کر دیتے، مندروں کے انہدام سے بھی زیادہ آزردہ نہیں ہوتے (ہسٹری آف اورنگ زیب جلد ۱ صفحہ ۲۹، جلد ۵ صفحہ ۱۱۰، ۳۱، ۲۱۱، ۴۵)

سیواجی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے خلاف نیشنلزم اور حب الوطنی کی جنگ لڑا، مگر سیواجی کا داماد اچل جی اورنگ زیب کے دربار کا پنج ہزاری منصبدار رہا، نخور کے راجہ دیان کوجی کا لڑکا سیواجی کا بھتیجا تھا، وہ اورنگ زیب کے دربار سے منسلک ہونے کے لئے شش ہزاری منصب کا خواستگار تھا، مادھاجی نراین بھی سیواجی کا بھتیجا تھا، وہ اپنے لڑکے اور بھتیجے کے ساتھ اورنگ زیب کا طرف دار ہو گیا تھا،

اورنگ زیب کے ہندو فوجی امراء میں رائے سنگھ سیودیہ، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، کیرت سنگھ، متر سین، اندرامن بندیلہ، امر سنگھ، کمار سنگھ، راجہ جے سنگھ وغیرہ اس کے خلاف برابر لڑتے رہے، خود سیواجی نے سلہیر کے محاصرہ میں امر سنگھ اور اس کے بیس ساتھیوں کو گرفتار کر کے اسکے ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا،

مرہٹوں نے پیشواؤں کی نگرانی میں راجپوتانہ پر بار بار حملے کر کے جو غارتگری اور خونریزی کی وہ ہندوستان کی تاریخ کی بڑی المناک داستان ہے، اور جب احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان میں ان سے لڑا تو راجپوتوں کا کوئی قبیلہ ان کی حمایت میں نہیں پہونچا اور ایک ابھرتی ہوئی قوم اس جنگ کے بعد بالکل دب کر رہ گئی،

اوپر کی تفصیلات سے ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کون کس کیلئے غدار ہوا، اور کس کی غداری سے ملک کو نقصان پہونچتا رہا، معارف کی پانچ اشاعتوں میں غداروں کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اُس سے یہ اندازہ ہو گا کہ سیاسی اقتدار کی خاطر ہر قوم اور ہر مذہب میں ایسے غدار پیدا ہوتے رہے ہیں، تو کیا تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاست اور بادشاہت کے معاملہ میں بیٹے اور داماد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے، بادشاہ کا کوئی حقیقی رشتہ دار نہیں ہوتا ہے، شہزادے بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں، وہ انکی طرح اپنے والدین کو کھا کر ہضم کر جانے میں مشاق ہوتے ہیں، مگر اسلام کی تو یہ تعلیم نہیں رہی، ہمارے رسول اکرمؐ اپنی سیاسی اور معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر موقع پر نذیر و بشیر رہے، اگر آپ کے پیرو ون نے آپ کی پیروی نہیں کی تو یہ سراسر اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

تمہید جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دار المصنفین اور اڈیٹر معارف کی رحلت کو چھ سال ہو گئے ہیں، مگر وہ اب تک میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، دار المصنفین کے احاطہ میں ان کو آتے جاتے، اس کے کتب خانہ میں داخل ہوتے، میز پر ان کو لکھتے ہوئے پاتا ہوں، ان کی آواز سنائی دیتی ہے کہ وہ مجھکو پکار رہے ہیں، دار المصنفین کے متعلق باتیں کر رہے ہیں، میں کچھ کہہ رہا ہوں، وہ سن رہے ہیں، یا وہ کچھ کہہ رہے ہیں، میں سن رہا ہوں، ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں، خفا بھی ہو رہے ہیں، دلجوئی بھی کر رہے ہیں، وہ میری زندگی کے کچھ ایسے ضروری جز بن گئے تھے کہ ان کے بعد دار المصنفین وہی ہے، اس کے احاطہ کے اندر آم کے درختوں کی ڈالیاں پہلے ہی کی طرح جھومتی رہتی ہیں، اس کے سبزہ کی لہلہاہٹ پہلے ہی کی طرح باقی ہے، اس کے چمن کے پھولوں کی شادابی اور رعنائی اسی طرح قائم ہے، صبح ہوتی ہے، شام بھی آتی ہے، رات بھی گذر جاتی ہے، مگر میں اپنے دل کے نہاں خانہ کو روندھا روندھا، اجڑا اجڑا، بے کیف اور مفلس کا ایک چراغ پاتا ہوں،

ان کے ساتھ میں جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء تک یعنی ان کی زندگی کے آخری دن تک رہا، ان کی دم سازی، دل نوازی اور کرم فرمائی کے خزانے سے جو بیش بہا دولت مل سکتی تھی، ان سے برابر ملتی رہی، ان کی دائمی مفارقت سے یہ چھین لی گئی، جو شاید اب دنیا میں کسی اور گوشہ میں نہ مل سکیگی، میں دارالمصنفین ان کے یہاں آنے سے گیارہ سال بعد آیا وہ مجھ سے آٹھ نو سال سن میں بڑے تھے، مگر ہم دونوں رفتہ رفتہ اس طرح گھل مل گئے کہ ہم اور وہ ہم سن اور ہم درس معلوم ہونے لگے تھے، میں ان کے دل کا ترجمان بن گیا تھا، تو وہ میرے دل کی زبان بن گئے تھے،

ان کی وفات کے بعد ان کے حالات زندگی لکھنا چاہتا تھا، معارف کے ناظرین کا تقاضا تھا کہ ان کے لیے معارف کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے، مگر دل یہ کہتا کہ ان کے حالات کوئی لکھتا تو ہم ہی لکھتے، جب لکھنے کا خیال آتا، تو اپنے قلم کو فگار اور دل کو خوں چکاں پایا، غمناکی اور سوگواری کے ہجوم میں جو کچھ لکھنا چاہتا، قلم ساتھ نہ دیتا، اس تاخیر پر دل ملامت کرتا۔

جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا تو خیال ہوا کہ ایک ہمدم اور ہمراز کے سوانح حیات قلم بند کرنے میں رسمی سوانح نگاری کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی تو شاید یہ حق صحیح طور پر ادا ہو جاتا، ہم دونوں کی زندگی کچھ ایسی ملی جلی رہی کہ ان کے حالات زندگی کو ضبط تحریر کرنے میں میری ذات بھی سامنے آجاتی ہے، مولانا حالی نے یادگار غالب لکھتے وقت تحریر فرمایا تھا کہ غالب کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش نہیں آئے ہیں جن کو پھیلا کر ان کے سوانح حیات کو طویل کیا جاسکتا تھا، ان کی شاعری، ان کی زندگی کا اہم بالشان واقعہ ہے، شاہ صاحب کی زندگی بھی ہنگامہ خیز واقعات سے خالی رہی، مگر انھوں نے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ اور ان کے بعد دارالمصنفین کی آبرو بن کر جو زندگی گذاری اور پھر یہاں اکاون سال تک

رہ کر اپنی تصنیفی زندگی میں جو علمی کارنامے انجام دیئے وہی دراصل ان کی زندگی کا اہم بالشان واقعہ ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے میں کہیں کہیں میری حقیر ذات بھی سامنے آجائے گی، جس طرح لوگوں نے ۳۹ سال تک مجھکو ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور زندگی گذارتے دیکھا، اسی طرح اگر اس کتاب کے ناظرین ان کے ساتھ ایک بار پھر مجھ کو دیکھیں تو تعجب نہ کریں، کچھ دل کے تقاضے، کچھ قلم کی بے راہ روی اور کچھ رسمی سوانح نگاری سے ہٹ کر، شاہ صاحب مرحوم کو پیش کرنے اور ایک خاص ماحول میں لاکھڑا کرنے کی بجا اور بے جا خواہش کی بنا پر یہ تحریر کچھ سے کچھ ہو جائے تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، ہم دونوں کا اصل میدانِ عمل دارالمصنفین ہی رہا، اس لیے اس چمن کی روداد کے بغیر شاہ صاحب کھڑے نظر نہیں آسکتے تھے، ان کے ذاتی حالات اور علمی کارناموں کے سلسلہ میں سید صاحب مولانا مسعود علی ندوی نیز دارالمصنفین کے اور دوسرے خدمت گذاروں کے ذکر کے ساتھ اس ادارہ کی اور بہت سی باتیں ناگزیر طور پر قلم بند ہو جائیں گی، جو کچھ قلمبند ہو رہا ہے، اس کو زیادہ تر دارالمصنفین کے علمی اسٹیج پر جلوہ افروز رکھا گیا ہے، ان کے ساتھ مل کر دوسرے فرائض انجام دینے کے ذکر کرنے میں ناظرین کو کہیں میری خودستائی اور خودبینی کا شبہ بھی پیدا ہو تو وہ مجھکو مطعون کر کے میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک و تعالےٰ مجھ کو خودبینی کی لعنت سے محفوظ رکھیں، آمین!

شاہ صاحب کا خاندان

شاہ صاحب کو اپنے نسب اور خاندان پر بجا طور پر فخر تھا، کیونکہ وہ نویں صدی ہجری کے سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ حضرت احمد عبدالحق توشہ ردولوی کے خاندان سے تھے، جن کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، ان کے دادا شیخ داؤد ہندوستان کے فرماں روا سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء۔ ۱۳۱۶ء) کے عہد میں بلخ سے

ہندوستان آئے، وہ کچھ دنوں دہلی میں رہے، مگر جب سلطان علاء الدین خلجی نے ان کو ردولی
ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں جگہ دی تو وہ یہیں آکر سکونت پذیر ہوگئے، وہ حضرت نصیر الدین
چراغ دہلویؒ کے مرید اور خلیفہ بھی تھے، ان کے صاحبزادے کا نام محمد عمر تھا، جو صلاح وتقویٰ
سے آراستہ رہے، ان کے دو صاحبزادے تھے، ایک شیخ تقی الدین اور دوسرے شیخ احمد جن پر
بچپن ہی سے نور باطن اور معرفتِ حق کا غلبہ رہا، پیر کی تلاش میں کچھ دنوں سرگرداں رہے،
پھر پانی پت میں آکر حضرت جلال الدین کبیر الاولیاؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے خلافت پائی،
مگر سوزشِ عشقِ الٰہی اور طلبِ معرفت کا جذبہ اتنا غالب رہا کہ اولیاء اللہ کی تلاش میں
مختلف مقامات کی سیاحت کی، سندھ، پنجاب، بنگال اور بہار بھی پہنچے، پھر ردولی آکر
مسند رشد وہدایت پر متمکن ہو کر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مجدد ہوئے، اس کو سب سے
زیادہ فروغ ان ہی کی ذات اقدس سے ہوا، اور درویش صاحب تصرف، مظہر خوارقِ
عادات وکرامات، صاحب ذوق وشوق وسکر وفقر وتجرید تسلیم کیے گئے، ایک سو آٹھ
سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ھ میں وفات پائی، ردولی میں ان کا مزار اقدس
اب تک مرجعِ خلائق ہے،

ان ہی کے خانوادہ سے شاہ صاحب تھے، نویں صدی ہجری سے اب تک ان کے خاندان
میں بہت سے مشائخ اور بزرگانِ دین گذرے، اس لحاظ سے ردولی ایک مقدس قصبہ
بنا رہا، شاہ صاحب کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا عبد الحلیم کو اپنی علمی قابلیت کی وجہ
سے بڑی شہرت حاصل تھی، خود شاہ صاحب کے نانا جناب شرف الدین صاحب اپنے
زمانہ کے اچھے عالم تھے، حیدرآباد دکن حضور نظام کی ریاست میں ایک اچھے عہدہ پر
فائز تھے، وہاں سے پنشن پانے کے بعد اپنے وطن ردولی ہی میں آخر وقت تک مقیم رہے،

وہ شاہ امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید بھی تھے، اور مکہ معظمہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت
ہوئے، ان ہی کی نگرانی میں شاہ صاحب نے بچپن میں تربیت اور ابتدائی تعلیم پائی، گاؤں کے
ایک مولوی صاحب سے گلستان و بوستان پڑھی جس سے ان کی استعداد فارسی کی نشوونما ہوئی
شاہ صاحب کے خاندان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی رقمطراز ہیں،
شاہ صاحب قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے اس نامور و بلند [illegible]
خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس نے دور آخر میں حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی
رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے عزت و شہرت حاصل کی، مخدوم صاحب نویں صدی ہجری
کے اکابر اولیاء اللہ اور شیوخ طریقت میں سے تھے، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ
علیہ فرماتے تھے کہ بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد تھے اور اس میں
تو شبہ نہیں کہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کو ان کی ذات سے نئی زندگی ملی، اس شاخ پر
ثمر میں ان سے بلند پایہ کوئی عارف و محقق نظر نہیں آتا، افسوس ہے کہ بیشتر اولیائے
متقدمین اور شیوخ طریقت کی طرح انکے بھی حالات و ملفوظات کو قلمبند کرنے کا اہتمام
نہیں کیا گیا، اور جب اس کا ارادہ کیا گیا تو اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ سوائے مشہور
کرامات اور چند خاندانی روایات کے کوئی مواد نہیں مل سکا، ان ہی کے سلسلہ کے
مشہور شیخ طریقت حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے جن کو دو واسطوں سے
مخدوم صاحبؒ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، ان کے حالات و ملفوظات
جمع کرنے کی کوشش کی جس کے اردو ترجمہ کی سعادت شاہ صاحب کے حصہ میں
آئی، لیکن اس میں بھی وہ تفصیلات اور جزئیات نہیں ملتیں جن سے انکی شخصیت
و مقام کا پورا اندازہ کیا جا سکے، لیکن بعض بزرگوں کا کوئی واقعہ اور ان کی

زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ کتابوں میں ایسا نقل ہو گیا ہے کہ ان کی شخصیت و مرتبہ روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے، میرے نزدیک ان کے فضائل و مناقب کے پورے دفتر کی قائم مقامی کرتا ہے۔ اور حقیقتاً کوزہ میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ منصور بچہ تھا، جو اس کی زبان سے انا الحق نکل گیا، یہاں اللہ کے ایسے بندے ہیں جو سمندر کے سمندر پی چکے ہیں، اور ڈکار نہیں لیتے، یہ جملہ تنہا ان کی زندگی کے اصل جوہر اور ان کے مقام کی بلندی کو واضح کرتا ہے، یعنی عالی ظرفی، تحمل، استقامت اور دریا سے گذر جانا، اور دامن کو تر نہ ہونے دینا، (پرانے چراغ جلد اول)

مدرسۂ فرنگی محلی کی تعلیم

شاہ صاحب اپنے نانا صاحب اور اپنی خواہش پر عربی کی تعلیم پانے کے لیے لکھنؤ میں فرنگی محل کے مدرسہ میں داخل ہوئے، یہ مدرسہ اس وقت وہاں کے مشہور عالم مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی نگرانی میں چل رہا تھا،

شاہ صاحب اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی

مولانا عبد الباری فرنگی محلی، فرنگی محل کے بانی ملا نظام الدینؒ کی اولاد میں تھے، اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الوہابؒ سے تعلیم پاکر قسطنطنیہ گئے، جہاں ایسے استاد سے تحصیل علم کی جو آگے چل کر شریف مکہ ہوئے، ۱۹۰۶ء میں فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ قائم کیا، جو ایسا مقبول ہوا کہ اس زمانہ کی ریاستوں میں سے نانپارہ، محمود آباد اور رام پور سے اس کو امداد ملتی رہی، اسی مدرسہ میں شاہ صاحب کا داخلہ ہوا، ان کے نانا جناب مولوی شرف الدین صاحب کو مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بڑی عقیدت تھی، وہ اس وقت تک ایک جید عالم کے ساتھ ایک مذہبی پیشوا اور اہم سیاسی رہنما بھی بن چکے تھے، ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی تحریک میں حصہ لیا، ۱۹۱۰ء میں مؤید الاسلام کے صدر رہے، ۱۹۱۲ء میں انجمن ہلال احمر کے رکن بنائے گئے،

۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی تاسیس کی اور کانپور کی مسجد کے شہید ہونے پر جو تحریک چلی اس میں نمایاں حصہ لیا، مؤید الاسلام کا ایک وفد لے کر ہاننگٹن کے پاس لندن گیے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۱۹ء میں علمار کی جماعت کے ساتھ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی خلافت کی تحریک میں گاندھی جی کو اس کی تائید کرنے پر راضی کیا، ۱۹۱۹ء میں مرکزی خلافت کمیٹی قائم کی، اسی زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر بنائے گئے، ترک موالات کی تحریک میں ان کی شرکت کی وجہ سے بڑی جان پیدا ہو گئی، گاندھی جی کو یقین ہو گیا تھا، کہ ان کی وجہ سے گاؤکشی بند ہو جائیگی، ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں خلافت اور جزیرۃ العرب کی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اجمیر کی درگاہ کمیٹی کے رکن بھی تھے، ندوۃ العلمار لکھنؤ سے بڑی دلچسپی رکھی، قادریہ سلسلہ سے تعلق تھا، ان کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی، جس میں جہانگیر آباد کی رانی، بارہ بنکی کے قدوائی اور علی گڑھ کے شروانی خاندانوں کے ارکین، خواجہ عبد المجید کی بیگم اور بہن، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور سید جالب دہلوی وغیرہ سب ہی تھے، اسی طرح انھوں نے دین اور سیاست دونوں کو ملا رکھا تھا، ۱۹۲۶ء میں ان کی وفات ۴۸ سال کی عمر میں ہو گئی، استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات پر معارف میں بڑے غم انگیز شذرات لکھتے ہوئے اپنے انتہائی غم و الم کا اظہار اس طرح کیا،

"ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین و ملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہم رنگ شہدا تھے، ذاتی اخلاق جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی، ان کے اوصاف گراں مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماویٰ اور تنگدستوں کے دستگیر تھے"

عبادت گذار، شب زندہ دار اور حق کے طلب گار تھے، ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جد و جہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، انھیں کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، (معارف جنوری ۱۹۲۶ء)

فرنگی محل اور شاہ صاحب کے خاندان سے جو تعلقات رہے، اس کی تفصیل مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اس تحریر سے معلوم ہوگی،

"فرنگی محل کے خاندان کے حضرت مخدوم صاحبؒ کے خاندان سے تقریباً ساڑھے تین سو سال کے تعلقات تھے، بانی درس نظامی استاد الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے، اور ان کے تعلق سے ان کے تینوں بھائی بھی سید صاحب کے دست گرفتہ اور وابستۂ دامن تھے لیکن ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید سہالوی، مخدوم صاحب کے سلسلہ میں قاضی گھاسی بن داؤد الہ آبادی سے بیعت تھے، اس وقت سے فرنگی محل کے علماء مخدوم صاحب سے نسب و نسبت کا تعلق رکھنے والوں کے ساتھ پیرزادوں اور صاحبزادوں کا سا معاملہ کرتے ہیں۔"

شاہ صاحب فرنگی محل کے مدرسہ میں داخل ہوئے تو مولانا عبدالباری ہی کی نگرانی میں رہے، جو ان کی بڑی سعادت اور خوش قسمتی تھی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی حضرت احمد عبدالحق توشہ ردولوی کے روحانی کمالات سے بہت متاثر تھے، ان کے خاندان کے ہر فرد سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، اپنے صاحبزادے مولانا جمال میاں کی شادی اسی درگاہ کے سابق سجادہ نشین جناب شاہ حیات احمد صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے کی، شاہ صاحب اسی خاندان کے ایک

فرد تھے، اس لیے فرنگی محل میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، اس زمانہ میں فرنگی محل کے مدرسہ کے مشہور مدرس مولانا عنایت اللہ تھے، شاہ صاحب مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ ان کا بھی ذکر ضرور کرتے، وہ بھی حضرت شاہ احمد عبدالحقؒ کے بہت معترف تھے، شاہ صاحب اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب کبھی فرنگی محل گئے، وہاں کے لوگوں نے ان کو نذرانے پیش کیے، جو وہ بہت تکلف کے ساتھ قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے، یہ واقعہ برابر بیان کرتے کہ ایک مرتبہ وہ فرنگی محل گئے تو اس وقت مولانا عبدالباری کے بھتیجے اور ان کے جانشین مولانا قطب الدین عبدالوالی نے جو قطب میاں کے نام سے مشہور تھے، نذر پیش کی، انھوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کیا کہ ان کا یہ معمول نہیں، اور وہ اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے، قطب میاں نے فرمایا کہ یہ تو ہمارا حق ہے، اور آپ کو لینا پڑے گا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم

وہ فرنگی محل کے مدرسہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں چلے آئے، جہاں سے فضیلت کی سند حاصل کی، وہاں تین سال رہے، ندوہ کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ، مولانا حیدر حسن، مولانا شبلی فقیہ اور مولانا عبدالسبحان دیسنوی، مولانا عبدالودود اور مولانا عبدالرحمن نگرامی کا ذکر برابر کرتے، مولانا حفیظ اللہ اس زمانہ میں مہتمم تھے، مولانا حیدر حسن حدیث کا درس دیتے، مولانا شبلی فقہ پڑھاتے، مولانا عبدالودود معقولات اور مولانا عبدالرحمن نگرامی تفسیر پڑھانے میں مشہور تھے، شاہ صاحب مولانا عبدالرحمن نگرامی کے فضل و کمال، وسعت نظر، انکسار، اپنے شاگردوں سے محبت و شفقت اور خدا کے سوا ہر بڑائی سے نڈرپن کا ذکر برابر کرتے، مولانا عبدالسبحان ادب کے استاذ تھے، وہ ندوہ کی تعلیم سے جیسے ہی فارغ ہوئے، ان کو اور ان کے ہم درس مولوی ریاست علی ندوی کو ۱۹۲۴ء میں دار المصنفین بلا لیا گیا، اور ان کا ماہانہ وظیفہ پچیس روپے مقرر ہوا،

شاہ صاحب کی پہلی شادی

شاہ صاحب کی شادی بہت ہی کمسنی میں ہوگئی تھی، شاید ۱۸ برس کے رہے ہوں گے کہ ان کی شادی ان کی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے ہوگئی تھی، جن سے ایک صاحبزادے شاہ ودود احمد ہیں، وہ آج کل کراچی میں ہیں، ایک بچہ اور ایک بچی کے باپ ہیں، شاہ صاحب کے خسر جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب اکاؤنٹنسی کا امتحان لندن سے پاس کیے ہوئے تھے، وہاں سے آکر بھوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل ہوگئے تھے، شاہ صاحب کی پھوپھی کے انتقال کے بعد ان کی شادی گیا کی ایک متمول بیوہ سے ہوگئی تھی، وہ گیا ہی میں رہنے لگے تھے، وہیں ۱۹۶۱ء میں وفات پائی، حضرت شاہ احمد عبدالحق رودولوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، ان کے سالانہ عرس میں ضرور شریک ہوتے، قوالوں کو بڑی فیاضی سے نذرانے دیتے، کبھی کبھی تو شیروانی اور اپنی گھڑی تک ان کو دیدیتے، شاہ صاحب ان کا ذکر خیر برابر کرتے رہتے، ان کے حالات خود اس طرح لکھے ہیں کہ ان کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونہ تھی، وہ حضرت مخدوم عبدالحق رودولوی قدس سرہٗ کی اولاد میں تھے، اللہ تعالےٰ نے ان کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، وہ علی گڈھ کالج کے پرانے تعلیم یافتہ تھے، تہجد کی نماز تک کبھی ناغہ نہیں ہوئی، لندن کے قیام کے زمانہ میں بھی روزے، نماز کی پابندی میں فرق نہیں آیا، اس زمانہ میں جب تک ذبیحہ کے متعلق پورا اطمینان نہ ہوجاتا گوشت نہ کھاتے تھے، سبزی اور انڈے پر ہی قناعت کرتے تھے، پہلی جنگ عظیم چھڑنے کے بعد ایمڈن جہاز سے واپس آرہے تھے، جس کو جرمنی نے تارپیڈو کردیا تھا، اس کے جو مسافر بچ گئے تھے، اُن میں ایک شاہ صاحب بھی تھے، انھوں نے کل سامان چھوڑ کر صرف کلام مجید ساتھ لے لیا تھا، انھوں نے معمولی حیثیت سے ترقی کی اور بڑی دولت پیدا کی اور فیاضی سے ان کو مذہبی و ملی کاموں اور غریبوں اور مسکینوں پر صرف کیا، ان کے در سے کوئی مستحق

واپس نہ جاتا تھا، اہم کاموں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیدیتے تھے خواجہ کمال الدین مرحوم کو کلام مجید کے جرمن ترجمے کے لئے دس ہزار روپیہ دیے تھے، تحریک خلافت کے زمانہ میں خلافت کمیٹی اور اس کے لیڈروں کی بھی مدد کرتے رہے، اس زمانہ میں ترکون کی مدد کے لیے ہندوستان میں جو انگورہ فنڈ قائم ہوا اسکے پُرجوش معاون تھے، مسلم یونیورسٹی سے پرانا تعلق تھا، کئی سال تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے اسکے علاوہ اور ہر قسم کے دنیاوی اعزازت سے انھوں نے ہمیشہ دامن بچایا، بہت سے غریب گھرانے ان کی ذات سے پرورش پاتے تھے، مگر خود انکی زندگی بڑی سادہ اور دوسروں کے لیے نمونہ تھی، (معارف فروری ۱۹۶۱ء)

شاہ صاحب کے والد مرحوم

شاہ صاحب کے والد مرحوم جناب ابوالحسنات صاحب کو انکی جوانی ہی میں خلل دماغ کا مرض ہوگیا تھا، جو انکی وفات تک قائم رہا، شاہ صاحب سے چھوٹے انکے بھائی شاہ امام احمد صاحب تھے انھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی،

شاہ صاحب اپنی والدہ مرحومہ کا ذکر بہت والہانہ انداز میں کرتے،

شاہ صاحب کی ازدواجی زندگی

انکی پہلی اہلیہ شادی کے مشکل سے پانچ چھ سال زندہ رہی ہوں گی کہ اللہ کو پیاری ہوگئیں، انہی کی مفارقت کے غم میں ۵۔۶ سال تک شادی نہیں کی۔

ان کی والدہ نے بہت اصرار کرکے ان کا دوسرا نکاح رودولی ہی میں جناب منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی سے کر دیا۔ ان سے ایک لڑکی۔۔ غوثیہ سلمہا ہیں، جو شاہ مصطفیٰ احمد مرحوم کے نواسے اور چودھری سرفراز احمد مرحوم کے صاحبزادے چودھری محمد ادیس صاحب سے بیاہی گئی ہیں، اور ماشاء اللہ کئی بچوں کی ماں ہیں، اپنے رئیس شوہر کے ساتھ فارغ البالی کی زندگی سے مالامال ہیں،

رودولی کے عرس سے استفادہ

شاہ صاحب بچپن سے حضرت مخدوم عبدالحق رحؒ کے عرس کے موقع پر وہاں کی محفل سماع میں شرکت کرتے رہے، گو جب دارالمصنفین آئے تو اس میں ان کی شرکت کم ہونے لگی، مگر یہاں رہ کر برابر اس محفل کا ذکر کرتے اور کہتے کہ ایسی مہذب، مودب اور باوقار محفل

کہیں اور نہیں ہوتی، قوال اس میں زیادہ تر فارسی کی بہت اونچی نعتیں اور غزلیں پڑھتے ہیں، جو بہت ہی ادب کے ساتھ سنی جاتیں، وہ کہتے کہ ان کے ذوق شعری اور فارسی شاعری سے لگاؤ ان ہی محفلوں سے ہوا، اس کی تائید مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی اپنے مضمون میں یہ لکھ کر کی ہے کہ ان محفلوں کا اثر ان کی طبیعت میں آخر آخر تک رہا، انھوں نے کئی بار فرمایا کہ اچھے اشعار کا یاد رہ جانا، اور فارسی اور اردو کلام کا پاکیزہ ذوق سماع کی ان ہی محفلوں کا فیض ہے،

اسی فیض کی بدولت ان کو جامی اور فرید الدین عطار کی نعتوں کے بہت سے اشعار یاد تھے، جو ان کو سفر حج کے موقع پر بہت کام آئے۔

شاہ صاحب کی مضمون نگاری

وہ دار المصنفین آئے تو ان کی دبی ہوئی علمی اور ادبی صلاحیتیں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی اور صحبت میں خوب ابھریں، حضرت سید صاحب تربیت دینے کے سلسلہ میں نئے رفقاء سے معارف کے لئے اخبار علمیہ لکھواتے عربی اور انگریزی جرائد کے اچھے مضامین کے ترجمے یا تلخیص کراتے، یا کتابوں پر ریویو اور تقریظ لکھنے کو کہتے، شاہ صاحب نے بھی شروع میں معارف کے لیے یہ سب کچھ کیا، اسکے علاوہ ان کا قیام دار المصنفین ہی کے احاطہ میں رہا، جہاں ان کی نظروں کے سامنے حضرت سید صاحب برابر جلوہ گر رہے، ان کے شاگرد غیر شعوری طور پر محسوس کرتے کہ ان کے آفتاب علم کی شعاعیں برابر ان پر پڑ رہی ہیں، اور ان کے ذہن و دماغ میں علمی گرمی اور حرارت پہونچ رہی ہے، حضرت سید صاحب کا دستور یہ بھی تھا کہ کتب خانہ کے اندر، پھر کھانے اور چائے پر اپنے شاگردوں کو بہت ہی وزن، وقار اور اختصار کے ساتھ مخاطب کرتے، جس میں محبت اور لنیت کے ساتھ علم و فن کی عشوہ گری بھی ہوتی، انکی علمی کرامت یہ تھی کہ دو چار جملوں میں اپنے شاگردوں کے ذہن کے بند دریچے کھولدیتے،

پھر زیادہ استفسار کرنے یا کریدنے کی ضرورت نہ ہوتی، یکایک محسوس ہوتا کہ جو کچھ معلوم نہ تھا، اب معلوم ہو گیا ہے، اور تاریکی میں روشنی پھوٹ پڑی ہے، شاہ صاحب نے سید صاحب کے اس انداز تربیت سے پورا استفادہ کیا، اپنے استاد محترم کی نگرانی میں قلم پکڑا تو صاحب قلم ہونے کے مدارج تیزی سے طے کرنے لگے، انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں معارف کے لیے اخبار علمیہ بھی لکھے، مضامین کی تلخیص بھی کی، ترجمے بھی کیے، اس زمانہ میں عرب کی جو مختلف حکومتیں جہاں جہاں تھیں ان پر عربی میں ایک کتاب آئی تھی، حضرت سید صاحب کی فرمایش پر معارف کے لیے اس کی تلخیص کرتے رہے، جس کا سلسلہ کئی برسوں تک چلا، یہاں تک کہ یہ ایک کتاب بن گئی، اس کا ذکر آگے آئیگا،

باقیات فانی پر تقریظ

ان چیزوں کے علاوہ شاہ صاحب کی پہلی جاندار تحریر باقیات فانی پر نکلی، جو مئی ۱۹۲۷ء کے معارف کے باب التقریظ والانتقاد میں شایع ہوئی، دار المصنفین میں آئے ہوئے ان کو ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، ان کی علمی زندگی کا ابتدائی دور تھا، گویا قلم پکڑنا سیکھ رہے تھے، مگر باقیات فانی پر جو تقریظ لکھی اس کو آج بھی جب کہ اردو میں تنقید نگاری کا فن بہت آگے جا چکا ہے، کوئی پڑھے گا، اور اسکو یہ نہ بتایا جائے کہ اس کے لکھنے والے نے اپنی عمر کے کس حصہ میں اس کو لکھا تھا تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ یہ کسی کہنہ مشق نقاد اور اہل قلم کی لکھی ہوئی ہے، اس میں ادب کی ایسی گل کاریاں بھی ہیں، جن کی شامہ نوازی آج بھی ہو سکتی ہے، مثلاً اس تحریر کے شروع میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے کچھ حصے یہ ہیں،

"آزاد، حالی اور اکبر شاعری کی دوسری صنفوں کو مثلاً قصائد، قطعات، رباعیات کو قدیم طرز کے تنگ کوچہ سے آزاد کر کے جدید طرز شاعری کے وسیع میدان میں لے آئے، مگر غزل میں آکر یہ بوڑھے بھی اپنے

عشق و محبت کی قدیم داستانوں کو نہ بھلا سکے، اور اپنی جوانی کی روداد حسن و عشق کے اظہار میں کوئی تاویل، تحریف اور تغییر مناسب نہ سمجھی، نوجوان اقبال نے جدید تعلیم و خیالات کے زور سے اپنے لئے نیا راستہ نکالا اور کیکہ و تنہا اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اپنا سفر شروع کر دیا، غزل کی دنیا میں انقلاب درحقیقت حسرت نے پیدا کیا، اگر وہ قید خانہ کی بے کاری میں کام پیدا کرنے کے لیے شاعری نہ کیا کرتے تو ان کی اولیت کے مہر کو کوئی مٹا نہیں سکتا تھا، جوہر کا حال ان سے مختلف رہا، ان کو زلیخائے شاعری کا دیدار زندان یوسف ہی میں نظر آتا، وہاں جب باہر آئے، تو مصر قومی کے قحط کے بند و بست سے ان کو فرصت نہ ملی، حسرت کے بعد عزیز، فانی، اصغر اور جگر نے موسم کے اس تغیر کو بالکل نمایاں کر دیا، اور غزل کی زمین پر پرانے گل و ریاحین کے بدلے نئے نئے رنگ اور نئے نئے پھول کھلائے، اس دور کے خیالات جو ابھی تک درجہ تکوین میں ہے پچھلے دور سے جو ختم ہو چکا، بالکل مختلف ہیں، اصطلاحات، محاورات اور زبان و طرز ادا میں غیر معمولی فرق پیدا ہے"۔

کیسی دلآویز تحریر ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لکھنے والے کی پہلی کوشش ہے اور ابھی وہ لکھنے کی تربیت حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے،

اسی باقیات فانی میں اردو شاعری پر مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ۳۰ صفحے کا ایک مبسوط ریویو ہے، اس میں انھوں نے فانی اور غالب کا موازنہ بھی کیا تھا، جس سے شاہ صاحب کو اتفاق نہ تھا، اس پر وہ بہت ہی خوبصورت انداز میں یہ تبصرہ کرتے ہیں،

"غالب کے گلاب آمیز بادہ کو فانی کی سوڈا واٹر ملی ہوئی شراب سے کوئی مناسبت نہیں، فانی کے صرف دس پانچ اشعار ایسے مل سکتے ہیں جو غالب کے اشعار کے مقابل میں پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن غالب کے بیسیوں اشعار ایسے ہیں کہ فانی کا خیال وہاں تک مشکل پہونچ سکتا ہے"۔

یہ تبصرہ ایسا ہے جس سے آج کا بڑے سے بڑا نقاد اختلاف نہیں کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب رشید احمد صاحب کی خوبیوں کے بڑے معترف رہے، ان کے چھوٹے بھائی نیاز احمد صدیقی ان کے ہمراز اور دمساز تھے، لیکن انھوں نے ان تعلقات کا خیال کئے بغیر رشید صاحب کی تنقید نگاری پر اس بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔

"وہ صرف ایک خاص قسم کے خیالات کی تعبیر و ادا کے لیے موزوں ہیں، سنجیدہ ظریفانہ مضامین کے طرز خاص کے موجد ہیں، اور اس بزم میں ان کے یہ قہقہے محفل میں رونق پیدا کرتے ہیں، مگر فلسفیانہ اور ٹھوس خیالات ان کے قہقہوں کی گونج میں منتشر ہو جاتے ہیں، بہر حال وہ سرد و بستان ہے، امید ہے کہ یہ سرد و بعض سرستوں کی یاد دہانی کا فرض ادا کر دے گا"۔

اس میں جناب جگر مراد آبادی کی بھی ایک تحریر فانی کی شاعری پر تھی جو شاہ صاحب کو پسند نہیں آئی، اس کے ہلکے پن کو انھوں نے یہ لکھ کر ظاہر کیا،

تیسرے حصہ میں جناب جگر مراد آبادی کا ۱۰ صفحے کا تبصرہ ہے، ہمارے خیال میں یہ حصہ بالکل غیر ضروری تھا، نقاد شاعر نے خود بھی اس کلیہ کو سمجھ لیا ہے کہ ہر شاعر کا نقاد ہونا ضروری نہیں،

اس کے بعد فانی کی شاعری پر طویل تبصرہ ہے، جس کا خلاصہ شاہ صاحب کے الفاظ میں

اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، (۱) کہ مرنے کے بعد خاک عاشق کا دامن یار سے لپٹ کر دل کی بھڑاس نکالنا ایک پامال مضمون ہے، جس کو سیکڑوں شعرا نے نظم کیا ہے، لیکن فانی کی ندرت سے ان کو کوئی نسبت نہیں، ان کی خاک بھی دامن یار سے لپٹی ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں احترام حسن کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے، خاک عاشق کی گستاخ دستی پر یار کی عتاب آلود نگاہ پڑ جاتی ہے، ذرہائے خاک میں احساس تقصیر پیدا ہوتا ہے، اور وہ حالت فنا میں بھی کانپ اٹھتے ہیں، (۲) خزاں کی بربادیوں اور بہار کی رنگینیوں کے مناظر شعرا کے یہاں بہت دیکھے گئے، لیکن فانی کی تعبیر نے جو بہار پیدا کر دی ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، ان کے یہاں خزاں اور بہار صرف معشوق کی دو مختلف کیفیتوں کے مظاہر ہیں (۳) آہ و نالۂ عشاق کا کارگر حربہ ہے کہ اسی کے اثر سے محبوب مشق ستم چھوڑ کر مائل بہ کرم ہو جاتا ہے، لیکن اسی غم خوار عشاق کی تاثیر فانی کے یہاں سرمایۂ انفعال و ندامت بن جاتی ہے، اور اس کی بدولت کرم تو کجا لطف ستم بھی چھن جاتا ہے، (۴) شعرا عموماً ہجر کے مصائب و عشق کی نامرادیوں سے تنگ آ کر موت سے مصائب کا خاتمہ چاہتے ہیں لیکن ان کا عشق ان سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے، ان کے یہاں عشق میں مرنا شہادت کا ہم پایہ اور کسی کی یاد میں جان دینا خدا کی راہ میں کام آنے کے برابر ہے (۵) فراق کی راتوں میں دل کی تڑپ کا مضمون شعرا نے مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے، لیکن فانی کی تڑپ سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، ان کے یہاں ہر درد و ہر کرب کی آخری حد یہ ہے کہ سکون ہو جائے، اس لئے انتہائی اضطراب کے بعد سکون لازمی ہے، لیکن فانی اس سکون کو سکون ہی نہیں مانتے، بلکہ اضطراب کی دوسری شکل سمجھتے ہیں، (۶) رشک کی یہ صورت شاید پہلی دفعہ فانی کے ذریعہ سے دنیا پر ظاہر ہوئی کہ عاشق نگاہ التفات کا پیاسا موجود ہے، معشوق آئینہ خانہ میں

حسن و جمال کی رعنائی دیکھتا ہے، ساتھ اسکو یہ بھی خیال آتا ہے کہ عاشق کو میرے عکس سے رشک نہ آ جائے کہ وہ حیرت سے مجھکو تک رہا ہے، اس لئے فوراً عاشق کے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے کہ اس کے جذبۂ رشک کا اندازہ لگائے (۷) معشوق کے ہاتھوں عاشق کا قتل اور اس قتل بے گناہی کا قصاص روز محشر پر اٹھا رکھنا ایک عام بات ہے، لیکن فانی دنیا ہی میں انتقام اور زبردست انتقام لینے کے حامی ہیں، (۸) کلیم اور طور کا واقعہ شعرا کا خاص موضوع ہے، لیکن فانی عام شعرا کے برخلاف یہ دکھاتے ہیں کہ طور پر ذات کی تجلی نہ تھی، صفات کی جلوہ آرائی تھی، (۹) برق و نشیمن کی چشمک بہت قدیم ہے، لیکن فانی نے ہوس تعمیر ہی کو برق سے تعبیر کیا ہے، (۱۰) شاعری میں چاک گریبانی عام چیز ہے، لیکن فانی اسکو چاک سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ گریبان کا دامن سے گلے ملنا کہتے ہیں (۱۱) فانی کی شاعری محض عشق کے جذبات لطیفہ تک محدود نہیں بلکہ اس میں اخلاق و تصوف کے حکیمانہ اور نازک مسائل ہیں، وحدت الوجود کو انھوں نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے سمجھایا ہے، ان کی شاعری میں خودداری کا بھی پیام ہے، (۱۲) اگرچہ فانی کا رنگ یاس و ناکامی ہے، جس میں شوخیوں کی زندہ دلی گو بار نہیں، تاہم ان کا کلام اس سے خالی بھی نہیں (۱۳) ان کے یہاں زبان کی بھی حلاوت ہے، بندش و ترکیب کا حسن بھی ہے، دل وفا خراب، اشک ادا، گرد دامن، اور نالۂ خموش مسلسل وغیرہ جیسی نئی ترکیبیں بھی ہیں، (۱۴) ان کا خاص رنگ سوز و گداز اور خستگی و افتادگی ہے، اس سے مطلب نالہ و شیون یا مرثیہ و ماتم نہیں، بلکہ درد آشنا دلوں کی وہ واردات ہیں جو سامع کے دل پر بھی وہی تاثرات طاری کر دیتی ہیں، جنھوں نے ان کے قلب کو ایک حسرت کدہ بنا دیا ہے، اس خلاصہ سے اصل متن کی ادبی رنگینی، تحریری شگفتگی اور تنقیدی ژرف بینی کا اندازہ ہوگا،

یہ تقریظ اس وقت شائع ہوئی تھی جب خود فانی زندہ تھے،

وہ اس سے ضرور محظوظ ہوئے ہونگے، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک فانی کی شاعری پر اتنا متوازن اور سیر حاصل تبصرہ شایع نہیں ہوا تھا، اور جس بہتر ادبی پیرایہ میں یہ لکھا گیا ہے، اس کی داد آج بھی مل سکتی ہے، دبستان شبلی کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اس کی طرف سے شعر و ادب پر تنقیدیں شایع ہوتی ہیں، تو ہر دعوی کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے، آج کل کے نقادوں کی طرح کوئی ایسی بات نہیں کہی جاتی ہے کہ ان کے ناظرین اسکو اس لئے صحیح سمجھیں کہ وہ کہہ رہے ہیں، شاہ صاحب نے اور جتنی باتیں کہی ہیں، ان کو خود فانی کے اشعار نقل کر کے باوزن بنایا ہے، اس طرح انکے انداز بیان اور فانی کی شاعری میں چقماق کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، مگر شاہ صاحب برابر اس کو اپنے ابتدائی دور کی ایک کوشش سمجھتے رہے، اس لئے اس کی اہمیت ان کی نظروں میں زیادہ نہیں رہی، اور جب انھوں نے اپنے ادبی مضامین کا ایک انتخاب "ادبی نقوش" کے نام سے مرتب کیا تو اس میں اس تقریظ کو شامل کرنا پسند نہیں کیا، شاہ صاحب کی اس ادبی اٹھان کو دیکھ کر دارالمصنفین کے کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ان کو صرف شعر و ادب پر مضامین اور کتابیں لکھنے کیلئے مخصوص کر دیا جائے اور ادبی کتابیں لکھوانی چاہئیں، لیکن حضرت سید صاحب شعر و ادب سے متعلق تحریروں کو علمی دسترخوان کی محض چٹنی قرار دیتے تھے، جو ان کے نزدیک صرف ذائقہ بدلنے کے لئے تو ٹھیک ہے، مگر اس کو علمی دسترخوان کے سنگین کھانوں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے، اسی لئے شاہ صاحب کی علمی زندگی کا رخ بدل گیا،

شاہ صاحب نے اگست ۱۹۲۶ء کے معارف میں صراط الحمید پر بھی ایک تقریظ لکھی، یہ جناب محمد الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے حج کا سفرنامہ تھا،

انوار العیون فی اسرار المکنون کا اردو ترجمہ

۱۹۲۶ء میں شاہ صاحب نے اپنے جد امجد شیخ العالم مخدوم شاہ احمد عبدالحق صاحب توشہؒ کے ملفوظات انوار العیون فی اسرار المکنون کا اردو ترجمہ اپنے ایک بزرگ جناب عزیز احمد احمدی صاحب کی فرمایش پر کیا، اس مجموعہ کو حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے مرتب کیا تھا۔ جو حضرت احمد عبدالحقؒ کے پوتے جناب شیخ محمد بن احمد عارف سے بیعت اور شیخ احمد عارف کے داماد تھے، ان کو حضرت احمد عبدالحقؒ صاحب سے غیر معمولی عقیدت رہی، اس لیے انھوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا، جو گو حضرت احمد عبدالحقؒ کی وفات کے تقریباً دو سو سال بعد قلمبند کیا گیا، مگر یہی ان کے حالات، مناقب اور تعلیمات کا مستند ماخذ ہے، عام مجموعۂ ملفوظات کی طرح اس میں بھی بہت کچھ اغلاق اور ابہام ہے، جس کا سمجھنا آسان نہیں، اس لئے اردو میں اس کے ترجمے کی ضرورت تھی، شاہ صاحب نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا، اور اس کا ترجمہ تھوڑی مدت میں کر کے اپنے بزرگ جناب عزیز احمد احمدی کے سپرد کر دیا، جس کو انھوں نے معارف پریس ہی میں چھپوایا، شاہ صاحب کی اعلیٰ ظرفی اس ترجمہ میں اس حیثیت سے ظاہر ہوئی کہ انھوں نے مترجم کی حیثیت سے اس میں کہیں اپنا نام نہیں آنے دیا ہے لیکن راقم سطور کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ترجمہ ان ہی کا کیا ہوا ہے،

اسی سال اکتوبر ۱۹۲۶ء میں مہاجرین حصہ اول دارالمصنفین کی طرف سے شایع ہوئی جس کی تکمیل میں شاہ صاحب کا بھی حصہ رہا۔

مہاجرین حصہ اول کی تکمیل

شاہ صاحب کے آنے سے پہلے ان کے ہمنام حاجی معین الدین احمد ندوی کا قیام بھی کچھ دنوں دارالمصنفین میں رہا، وہ پٹنہ ضلع کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے، مگر استھانوان ضلع پٹنہ میں آباد ہو گئے تھے، دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے پہلے تو

خلفائے راشدین لکھی جو دار المصنفین کی مقبول مطبوعات میں سے ہے، پھر وہ مہاجرین حصہ اول کے لکھنے میں مشغول ہوئے، مگر اس کو ختم کرنے سے پہلے ان کو رام پور کے کتب خانہ میں وہاں کی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کے لئے بلا لیا گیا، وہ وہاں چلے گئے، تو مہاجرین حصہ اول نامکمل رہ گئی، سید صاحبؒ اس وقت تک شاہ صاحب کی تصنیفی صلاحیت سے مطمئن ہو چکے تھے اس لئے ان کو اس کے بقیہ حصہ کو مکمل کرنے کو کہا، ان ہی کے حکم سے شروع میں ۳۰ صفحے کا ایک بہت ہی فاضلانہ مقدمہ لکھا، اگر ان کے بجائے یہ مقدمہ حضرت سید صاحب کے نام سے شایع کر دیا جاتا، تو اس کے محققانہ رنگ کی وجہ سے کسی کو بھی شبہہ نہ ہوتا کہ یہ مقدمہ ان کا نہیں ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو اختصار سے یہاں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ شاہ صاحب کی جو ابتدائی علمی و تحقیقی اٹھان تھی، وہ بھی سامنے آجائے۔

اس میں مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف قبیلوں اور خانوادوں کی تاریخ ہے، جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے شروع ہوتی ہے، اس کے تین دور کئے گئے ہیں، پہلے دور میں حضرت اسمٰعیلؑ سے عدنان تک کے مختصر حالات ہیں، دوسرے دور میں عدنان سے فہر تک کی تفصیلات ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ اور عدنان کے درمیان تقریباً چالیس پشتیں تھیں، عدنان کے مختلف قبائل کا ذکر کر کے ان کی تجارت، مذہب اور خانہ جنگیوں پر اجمالی تبصرہ ہے، ان کے مذہب کو حضرت ابراہیمؑ نے پاک صاف کر کے توحید کی تعلیم دی مگر چند ہی پشتوں کے بعد ان میں بت پرستی رائج ہو گئی جو تمام عرب میں پھیل گئی،

اس کے بعد قریش کی تاریخ بہت تفصیل سے لکھی گئی ہے، قبیلہ قریش اور چھوٹے چھوٹے دس خانوادوں پر مشتمل تھا، جو سب کے سب فہر کی نسل سے تھے۔ فہر کے تین لڑکے تھے،

محارب، حارث، غالب، محارب اور حارث کی نسل زیادہ نہیں پھیلی، مگر حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح فاتح بیت المقدس، عقبہ بن نافع فاتح افریقہ اور عبد الملک بن قطبی والی اندلس وغیرہ بنو حارث ہی سے تھے، البتہ غالب کی اولاد بہت پھلی پھولی، اس میں سے حسب ذیل خانوادے زیادہ مشہور ہوئے، اکابر صحابہ کن کن قبیلوں سے تھے، وہ ان پر نظر ڈالنے سے سامنے آجائیں گے،

(۱) بنو ہاشم، رسول اللہ صلعم اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ، حضرت حمزہؓ اور آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ وغیرہ اسی قبیلہ سے تھے۔

(۲) بنو تیم - حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عمرؓ بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہؓ بن جدعان کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا،

(۳) بنو عدی، حضرت عمرؓ بن خطاب اور سعید بن زیدؓ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

(۴) بنی عبد الدار میں حضرت عثمانؓ بن طلحہ اور مصعبؓ بن عمیر تھے،

(۵) بنی اسد سے حضرت زبیرؓ بن عوام، ورقہ بن نوفل اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ تھیں،

(۶) بنو مخزوم سے خالدؓ بن ولید، عیاشؓ بن ربیعہ، ابو جہل، ام المومنین سلمہؓ تھیں،

(۷) بنو جمح سے صفوان بن امیہ اور محذورہؓ، (موذن نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تھے،

(۸) بنو امیہ سے حضرت عثمانؓ، امیر معاویہؓ اور ابو سفیانؓ وغیرہ تھے،

(۹) بنو سہم سے عمروؓ بن العاص فاتح مصر تھے،

شاہ صاحب اس کی طرف بھی ذہن منتقل کراتے ہیں کہ عام عربوں کی طرح یہ قریش بھی سخت جنگجو تھے، ان کے یہاں بات بات پر تلواریں نکل آتی تھیں، ان کی بہت سی لڑائیاں مشہور ہیں، ان ہی میں اصحاب فیل کا واقعہ ہے، حرم کعبہ کی تولیت کے لیے قریش، کنانہ، خزاعہ اور قضاعہ میں دو ہولناک لڑائیاں ہوئیں، خانہ کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں

جو خونریز جنگ ہونے کو تھی، اسکو انھوں نے آنحضرت صلعم کو آپ کی بعثت سے پہلے حکم مان کر روک دیا، پھر حرم کی تولیت اور اسکے انصرام و انتظام کے لئے جو کچھ کیا گیا تھا، اس کی تفصیل بتاتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ قصی نے حرم کی تولیت لے کر ایک چھوٹی سی جمہوریت قائم کی، جو باہمی مشورے سے چلتی تھی، اس سے قریش کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوا، قصی نے علٰحدہ علٰحدہ فوجی، عدالتی اور مذہبی نظام کے ذریعہ سے بہت سے عہدے قائم کئے، ان میں خانہ کعبہ کے مذہبی نظم و نسق کو زیادہ اہمیت دی، حج کے موقع پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہوتا تھا، اس سے بڑی آمدنی ہوتی تھی، لاکھوں روپیے نقد اور جنس کی صورت میں جمع ہوتے تھے، اس انتظام میں تمام قبائل کو شریک کیا گیا، خانہ کعبہ کی نگرانی اور حج کے موسم میں حاجیوں کو پانی پلانے کا کام بنو ہاشم کے سپرد کیا گیا، حجاج کے خورد و نوش وغیرہ کا انتظام بنو نوفل کو دیا گیا، خانۂ کعبہ کی کلید برداری بنو عذرا کو حاصل تھی، خانہ کعبہ میں کچھ تیر رکھے ہوئے تھے، ان سے ضرورت کے وقت استخارہ کیا جاتا تھا، اس کی حفاظت کی خدمت بنو جحج کو دی گئی، کعبہ کے بتوں کے لئے جو مال یا جائداد وقف کی جاتی اس کی نگرانی بنو سہم کے متعلق تھی، اہم کاموں کے مشورہ کے لیے قریش ایک عمارت دارالندوہ میں جمع ہوتے، جو خانہ کعبہ کے بالمقابل اس غرض سے تعمیر کی گئی تھی کہ مشورہ میں بنو اسد کی رائے لینی ضروری تھی، انسداد ظلم کے لئے بھی ان کے یہاں ایک انجمن تھی، یہ تمام تر معلومات ایسی ہیں جو شاید اردو میں پہلی دفعہ پیش کی گئیں،

پھر قریش کے مذہب کا ذکر خاص انداز میں کیا گیا ہے، جو اگرچہ ابراہیمی تھا لیکن ان میں اصنام پرستی اس قدر پھیل گئی تھی کہ دین حنیف کے خد و خال بالکل دھندے رہ گئے تھے، . . . . قریش کے مخصوص بت اساف اور نائلہ چاہ زمزم

کے پاس نصب تھے، وہ ان کے پاس قربانی کیا کرتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ یہ قبیلہ بنو جرہم کے مرد و عورت تھے، لیکن بعض گناہوں کے باعث پتھر ہو گئے، لات بنو ثقیف کا بت تھا، قریش اور کنانہ بھی اس کی پوجا کرتے تھے، اس کی تاریخ یہ ہے کہ لات مکہ میں ایک پتھر تھا جس پہ حجاج کے لئے ستو گوندھا جاتا تھا، اسی نام کا ایک شخص بنی ثقیف میں تھا، وہ مر گیا تو لوگوں کا خیال ہوا کہ وہ مرا نہیں بلکہ ہمنام پتھر میں گھس گیا ہے، اس وہم سے اس کی پرستش شروع ہو گئی، عزّیٰ بنو غطفان کا بت تھا، مگر قریش بھی اس کی پرستش کرتے تھے، یہاں قربانیاں کی جاتی تھیں، منات بنو خزاعہ اور ہذیل کا بت تھا، قریش اس کی بھی پوجا کرتے، قریش کا اعتقاد تھا کہ لات عزیٰ اور مناۃ خدا کی بیٹیاں ہیں، جو قیامت کے دن ان کی سفارش کریں گی، ان میں سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو خانہ کعبہ کے عین وسط میں نصب تھا اور بہت معزز بلانا جاتا، یہ سنگ سرخ کا انسانی مجسمہ تھا، اس کے سامنے انسان کی بھی قربانی کی جاتی، خانہ کعبہ کے اندر اور بت بھی تھے جن کی تعداد . . . تین سو ساٹھ (۳۶۰) تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بھی وہاں مورتیں تھیں، حج کے موقع پر طرح طرح کی بدعتیں رائج ہو گئی تھیں مثلاً خاموش حج کرتے، منہ سے نہ بولتے، ایک شخص دوسرے کو لگام لگا کر گھسیٹتا ہوا طواف کراتا، تلبیہ میں خدا کے نام کے ساتھ بتوں کے بھی نام لیتے، اس بت پرستی کے ساتھ ان میں شراب خواری، قمار بازی، زنا، دختر کشی، عیاشی اور اوہام پرستی بکثرت رائج تھیں، مگر وہ اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے،

اس زمانہ میں تجارت کی بڑی اہمیت تھی اس لئے شاہ صاحب اسکی پوری تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قریش زراعت کو عار سمجھتے، ان کے تجارتی قافلے ملکوں ملکوں پھر کر بیوپار کرتے تھے، ان کی تجارت بہت ہی با اصول اور منظم تھی گو رہزنی اور لوٹ مار عام تھی، مگر قریش کے کاروان تجارت سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا

اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش حرم کے متولی ہونے کی وجہ سے، جیران اور خدا کے پڑوسی کہلاتے تھے، اور ان کا بہت احترام کیا جاتا، آگے چل کر جو بڑے بڑے صحابہ ہوئے وہ بھی تجارت کیا کرتے تھے، عرب کی دنش تجارتی منڈیاں تھیں، ان میں قریش زیادہ تر بازار ذوالمجاز اور عکاظ میں شریک ہوتے۔

شاہ صاحب نے اس زمانہ کے شعر وادب کا بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

شاعری اور زبان آوری کا مذاق تمام عرب میں تھا، قبیلہ مضر کی زبان زیادہ معتبر تھی مگر قریش زیادہ فصیح اللسان مانے جاتے تھے، ان میں بڑے بڑے باکمال شعرا پیدا ہوئے، خاص بنو ہاشم میں متعدد شعرا تھے، تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ رواج تھا، گرچہ یہ عام نہ تھی تعلیم مردوں تک محدود نہ تھی بعض عورتوں نے بھی تعلیم حاصل کی، ان تمام تفصیلات کو لکھنے کا مقصد اس ماحول کو سامنے لانا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور اسلام کی تبلیغ کی گئی، شاہ صاحب نے اسلام کے ظہور کا ذکر جس طرح کیا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے، یہ انشاپردازانہ طرز ادا بھی ان کی تصنیف وتالیف کے ابتدائی دور کا نمونہ ہے، مگر اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ باوقار تحریر ان کے تصنیفی مستقبل کے روشن ہونے کی شہادت دے رہی تھی،

قریش بلکہ پورے عرب پر جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی کہ دفعۃً افق مکہ پر برق تجلی چمکی اور نور حق کا اجالا تمام عرب میں پھیل گیا، ابھی آفتاب رسالت کی کرنیں پھوٹی ہی تھیں کہ خیرہ چشموں کی آنکھیں تاب نظارہ نہ لا سکیں اور ہر چہار جانب سے ظلم وتعدی کے بادل امنڈنے لگے کہ نور حق کی روشنی کو تاریکی میں چھپا دیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کی ابتدا ہی کی تھی کہ ہر طرف مخالفت کے طوفان اٹھنے لگے، مگر سیل صداقت بڑھتا پھیلتا گیا، یہاں تک کہ ریگستان عرب کو رشک گلزار بنا دیا، (ص ۳۱-۳۵)

اس کے بعد قریش نے رسول اللہؐ اور آپ کے پیروؤں کے ساتھ جو ظلم وتعدی کی اس کا اجمالی

ذکر ہے، پھر حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت کی تفصیل ہے، جو مہاجر وہاں پہونچے ان کے نام بھی درج ہیں، مشرکین نے وہاں بھی پہونچ کر ان کے اخراج کی جس طرح کوشش کی اس کی بھی داستان ہے، اشاعت اسلام میں رسول اللہؐ کے مصائب لیکن آخر کامیابی کا ذکر مفصل طریقہ پر کیا گیا ہے، ہجرت مدینہ سے پہلے جن قبائل نے اسلام قبول کیا، اس کی بھی تفصیل ہے، اور جب قریش کے مظالم ناقابل برداشت ہوگئے، تو مدینہ میں جا کر مسلمان پناہ لینے لگے، جو مسلمان وہاں ..... ہجرت کرکے پہونچے ان میں سے اکثروں کے نام بھی دیئے گئے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور مدینہ ہجرت فرما گئے، پھر فتح مکہ تک اس ہجرت کا جو سلسلہ جاری رہا، ان سب کی تفصیلات دی گئی ہیں،

آخر میں شاہ صاحب نے مہاجرین کے فضائل ومناقب کلام پاک اور احادیث کی روشنی میں دکھائے ہیں، جو گو ان کی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں لکھی گئی لیکن اس سے ان کی بالغ نظری کی نشان دہی ہوتی ہے، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ مہاجرین کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اسلام کی خدمت سے پہلو تہی نہ کرتے تھے، فاقہ پر فاقہ کرتے، مگر ان کی جانفروشیوں میں فرق نہ آتا، اس کے بعد رقمطراز ہیں:

" مہاجرین کی ایک نمایاں فضیلت یہ تھی کہ ان کا دامن نفاق کے داغ سے پاک وصاف تھا، اس لئے منافق وہ لوگ تھے، جو درپردہ تو اسلام کے دشمن تھے، مگر خوف سے اس کا اظہار نہ کرسکتے تھے، یا وہ تھے جو مال ودولت کی طمع میں مسلمان ہوئے تھے، یا وہ تھے، جو خوف سے اسلام لائے تھے، اور مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اسلام ان تینوں چیزوں کی آمیزش سے پاک تھا، اس لئے

جب یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے اس وقت اسلام بالکل ابتدائی حالت میں تھا، نہ اس کے پاس مال و زر تھا، نہ قوت و حکومت تھی، بلکہ اس زمانہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی جان اور مال خود خطرہ میں پڑ گیا تھا، اس لئے ان کا اسلام خالصۃً للہ تھا،

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مہاجرین کی دوستی اور دشمنی دونوں کھلی ہوئی تھیں، وہ

وہ اس طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ نفاق انصار کے قبیلوں میں ظاہر ہوا اسی لیے مکی سورتوں میں کہیں نفاق و منافقت کا تذکرہ نہیں ہے، مدنی سورتوں میں اس کا بکثرت ذکر آتا ہے،

یہ مقدمہ اس لئے قابل قدر ثابت ہوا کہ جب مہاجرین کی دو جلدیں دار المصنفین سے شائع ہوئیں تو اس مقدمہ کی روشنی میں مہاجرین اور انصار کے تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملی، آگے چل کر ان میں جو کشمکش اور آویزش پیدا ہوئی، تو اس مقدمہ کی روشنی میں یہ پتہ چلانا آسان ہو گیا کہ کس کس موقع پر قبائلی تعصب سے اسلام کو نقصان پہونچا، اور کہاں اسلام کی اصلی اور سچی تعلیمات سے ان نقصانات کی تلافی ہوتی رہی، اس مقدمہ کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ گذر چکا ہے، لیکن اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھ کر ناظرین محسوس کریں گے، کہ ان سے ان کے ذہن میں جلا، معلومات میں تازگی اور ایمان میں حرارت پیدا ہوئی،

پہلے کہا گیا ہے کہ مہاجرین حصۂ اول کو جناب حاجی معین الدین صاحب ندوی ناکمل چھوڑ گئے تھے، شاہ صاحب نے طویل مقدمہ لکھنے کے ساتھ اس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ دونوں کے حالات ۳۰ صفحے میں

لکھ کر مکمل کیا، اس طرح اس کتاب کے چار سو بیس صفحوں میں ان کے لکھے ہوئے صفحات کی تعداد ۱۴۶ ہے، حاجی معین الدین احمد ندوی ایک پختہ کار مصنف سمجھے جاتے تھے، شاہ صاحب نے جب مہاجرین اول میں جو کچھ اضافہ کیا، اس وقت وہ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں بالکل مبتدی تھے، مگر اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے متعلق یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ شاہ صاحب کا لکھا ہوا ہے، تو کسی کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوگا کہ یہ حاجی معین الدین صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، جب آپؐ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی تو وہ صرف تیرہ برس کے تھے، مگر اس طفولیت کے زمانہ میں آپ کی عزت اور احترام کا جو نقش ان کے دل میں بیٹھا اس کی صحیح تصویر شاہ صاحب نے کھینچ دی، وہ لکھتے ہیں،

سعید بن جبیر تابعی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا پنجشنبہ کا دن، کون پنجشنبہ اتنا کہنے پائے تھے اور ابھی مبتدا کی خبر بھی نہ نکلی تھی کہ زار و قطار رونے لگے، اس قدر روئے کہ سامنے پڑے ہوئے سنگ ریزے ان کے آنسوؤں سے تر ہو گئے، ہم لوگوں نے کہا ابو العباس پنجشنبہ کے دن میں کیا خاص بات تھی، بولے اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری نے شدت پکڑی تھی،

اسی کے ساتھ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں ان کی شجاعت اور جانبازی، حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی آویزش میں ان کی اصابت رائے اور بصرہ میں ان کی گورنری، پھر مکہ میں آکر عزلت نشینی، کوفہ جانے سے پہلے امام حسین رضی اللہ عنہ کو صائب مشورہ دینے، قرآن پاک کی تفسیر و تاویل میں انکی مہارت

اور آیات قرآنی کے شانِ نزول اور ناسخ و منسوخ کے علم، ان کی وسعت نظر دقیقہ سنجی اور قوت استنباط، حدیث کی روایات کو معلوم کرنے کی ذاتی کاوش و جستجو، اور ان کو بیان کرنے میں احتیاط، حلقۂ درس میں ان کی مقبولیت، ان کی تقریر کی شیرنی اور معاصرین کا احترام وغیرہ کی مرقع آرائی شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اپنے ایمان میں حرارت پیدا کر سکتے ہیں،

اسی طرح حضرت ابو موسی اشعریؓ کی سیرت اور کردار کا بہت ہی جاندار نقشہ کھینچا ہے، جب وہ اسلام لاتے ہیں، تو شاہ صاحب اس کا ذکر اپنی تحریر کی شگفتگی کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں،

" ساقی توحید کے صلائے عام پر نزدیک والوں نے اپنے کان بند کر دیے تھے، لیکن تشنہ کامانِ حق دور دراز ممالک سے دشوار گذار منزلیں طے کرکے آتے تھے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے، حضرت ابو موسیٰؓ یمن سے چل کر مکہ آئے اور بادۂ اسلام کے ایک ہی جام میں سرشار ہوگئے، وہ مکہ میں قبیلہ عبد شمس سے حلیفانہ تعلق پیدا کرکے پھر مراجعت فرمائے وطن ہوئے کہ اپنے اعزہ اور احباب کو بھی یہ مژدۂ جانفزا سنائیں، (باقی)

حیات سلیمان

یہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی محض سوانح عمری ہی نہیں، بلکہ سید صاحب کے دور کی تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں اور ان کے نتائج و اثرات کی بہت ہی معلومات افزا تاریخ ہے، بہت ہی دلچسپ، دلآویز اور دلکش، اور اردو کے سوانحی ادب کے ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۔/۳۲

امام ابوالحسن مدائنی

(اسلامی ہند کے پہلے مورخ)

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ، بمبئی،

(۲)

مدائنی مدائن میں کیوں گئے، کب گئے اور کتنے دنوں وہاں مقیم رہے ان باتوں کے بارے میں ان کے تذکرہ نگار خاموش ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود وہ مدائنی کی نسبت سے مشہور ہیں، حضرت عبداللہؒ بن مبارک کا قول ہے کہ جو شخص کسی شہر میں چار سال تک مقیم ہو وہ اس شہر کی طرف منسوب ہوگا۔[1]

محدثین کے اس اصول کے رو سے مدائنی کم از کم چار سال تک مدائن میں مقیم رہے، ان کے شیوخ میں امام ابن ابی زائدہ مدائن کے قاضی تھے، اور زمانۂ قضا ہی میں ۱۸۳ھ میں وصال فرمایا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدائنی یہاں ۱۸۳ھ کے حدود میں سکونت پذیر تھے، مدائن عراق کا قدیم ترین شہر تھا جو کسرائیوں کا مرکزی مقام تھا، اسی کے قریب بغداد آباد ہوگیا تھا، بقول خطیب بغداد سے ایک دن کی مسافت سے کم دوری پر تھا، گویا مدائن بغداد کا نواحی شہر تھا، اور کسی نہ کسی درجہ میں اسکی مرکزیت باقی تھی،

مدائنی بغداد میں | اسی طرح مدائنی کے بغداد جانے کا زمانہ بھی معلوم نہیں ہے البتہ یہ بات

---

[1] تدریب الراوی ص ۳۴۳

یقینی ہے کہ وہ ۲۱۳ھ سے پہلے یہاں آچکے تھے، یاقوت کی روایت کے مطابق ان کو خلیفہ مامون نے ایک مرتبہ اپنے میر منشی ابوجعفر احمد بن یوسف کے ذریعہ دربار میں بلوایا تھا، اور احمد بن یوسف کا انتقال ۲۱۳ھ میں ہوا، اس لئے مدائنی اس سے پہلے بغداد آگئے تھے یہاں کی مدت اقامت مدائن کے مقابلہ میں طویل ہے، اور یہیں مدائنی کی شخصیت ابھری اور ان کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہوئے،

اس زمانہ میں بغداد ہر علم وفن کا مرکز بنا ہوا تھا، ہر طبقہ کے اہل علم اپنے قدر دانوں کی بدولت پُرسکون اور نشاط انگیز ماحول میں خوش وقت تھے، اسی دور میں اسلامی علوم وفنون کی امہات الکتب کی تالیف وتدوین ہوئی، مدائنی کو بھی بغداد میں اطمینان وسکون کی فضا میں آگے بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ملا، ایسے مواقع حسن اتفاق سے بہت کم اہل علم کو ملتے ہیں،

اسحاق بن ابراہیم موصلی کی قدردانی اور نوازش

بغداد میں مدائنی کو اسحٰق موصلی جیسا صاحب علم، علم وفن کا قدرداں اور محسن مل گیا اور وہ اس کے ندماء ومتعلقین میں ایسے شامل ہوئے کہ اسی مکان سے ان کا جنازہ نکلا، ابن ندیم نے ان کی وفات کے سلسلے میں تصریح کی ہے،

مات المدائنی	مدائنی کی وفات اسحٰق بن ابراہیم
فی منزل اسحٰق بن ابراھیم	موصلی کے مکان میں ہوئی۔ مدائنی
الموصلی وکان منقطعاً الیہ[1]	کا ان سے خصوصی تعلق تھا۔

یاقوت نے اس سے واضح انداز میں لکھا ہے،

واتصل باسحٰق بن ابراھیم	مدائنی اسحٰق بن ابراہیم موصلی سے
الموصلی فکان لا یفارق	یوں گھل مل گئے کہ ان کے مکان سے

[1] الفہرست ص ۱۴۶،

منزلہ وفی منزلہ کانت	جدا نہیں ہوتے تھے حتی کہ ان کی وفات
وفاتہ[1]	وہیں ہوئی۔

ابومحمد اسحٰق بن ابراہیم تمیمی موصلی متوفی ۲۳۵ھ صاحب کتاب الاغانی ابتدا میں محدث وفقیہ تھے، انھوں نے حدیث کی روایت سفیان بن عیینہ، ہشیم بن بشیر، ابو معاویہ ضریر وغیرہ سے کی، اور ادب وعربیت کی تعلیم اصمعی اور ابوعبیدہ وغیرہ سے حاصل کی، ان سے زبیر بن بکار، ابوالعیناء، میمون بن ہارون وغیرہ نے روایت کی، علم موسیقی وغناء میں مہارت وبراعت کی وجہ سے یہ فن ان کے دیگر علوم پر غالب آگیا، اور انھوں نے اس فن میں کتاب الاغانی لکھی اور صاحب الاغانی کی نسبت سے مشہور ہوئے، اہل علم وفن کے بڑے قدرداں تھے، سخاوت میں نیک نامی اور شہرت رکھتے تھے، عباسی خلفاء کے درباروں میں ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی،[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصلی کے آب ودانہ اور بغداد کی خاک گور کی کشش نے مدائنی کو مدائن سے بغداد کھینچا تھا، موصلی کی قدردانی اور مدائنی کے تشکر وامتنان کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے، مدائنی کے تلمیذ اور مشہور حافظ حدیث امام احمد بن ابی خیثمہ کا بیان ہے کہ میرے والد یحییٰ بن معین اور مصعب بن زبیری تینوں اہل علم شام کو مصعب بن زبیری کے دروازے پر بیٹھا کرتے تھے، ایک دن شام کا واقعہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے سے ایک خوش پوش وخوش وضع آدمی موٹے تازے گدھے پر گزرا، اس نے مجمع کو سلام کرکے یحییٰ بن معین سے کچھ بات کی، ابن معین نے اس سے کہا ابوالحسن! کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اسی شریف آدمی کے پاس جارہا ہوں جو میری آستین کو اوپر سے نیچے تک دراہم ودنانیر سے بھردیتا ہے، ابن معین نے کہا ابوالحسن! وہ کون شخص ہے؟ اس نے

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۹ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۸

جواب دیا وہ ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم موصلی ہے، اس کے بعد جب وہ آدمی چلا گیا تو ابن معین نے دو بار ثقہ ثقہ کہا، میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ تو بتایا کہ یہ مدائنی ہیں۔[1]

یہ واقعہ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں اور یاقوت نے معجم الادبار میں اختصار کے ساتھ لکھا ہے، اور دونوں میں مدائنی کے بارے میں ابن معین کا قول تین بار ثقہ ثقہ ہے۔[2]

<u>خلیفہ مامون کے دربار میں</u>: مدائنی کے علم و فضل کی شہرت نے عباسی خلفاء و امراء کو بھی ان کی طرف متوجہ کیا، عجب کیا ہے کہ عباسی دربار تک مدائنی کی رسائی میں ان کے محسن موصلی کا ہاتھ رہا ہو، جو خود بھی خلفاء کے نزدیک معظم و مکرم تھے، اس سلسلہ میں یاقوت نے خلیفہ مامون کے مدائنی کو بلانے اور ان سے علمی و سیاسی گفتگو کرنے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، مدائنی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ مامون (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) نے احمد بن یوسف کو حکم دیا کہ مجھے دربار میں طلب کیا جائے، اور جب میں دربار میں پہنچا تو مامون نے میرے سامنے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ذکر چھیڑا، میں نے ان کے بارے میں چند حدیثیں بیان کیں، یہاں تک کہ مامون نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بنو امیہ کے لعن طعن کا تذکرہ کیا، اس پر میں نے مامون کو بتایا کہ ابو سلمہ مثنی بن عبد اللہ محمد ابن عبد اللہ انصاری کے بھائی) نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ ان کو ایک شخص نے سنایا کہ میں نے ملک شام میں رہتے ہوئے وہاں کسی کا نام علی، حسن، حسین نہیں سنا، عام طور سے معاویہ، یزید، ولید نام سنتا تھا، ایک مرتبہ میں ایک شخص کے پاس سے گزرا جو اپنے دروازے پر بیٹھا تھا، مجھے پیاس لگ رہی تھی، میں نے اس سے پانی مانگا، اس نے یا حسن کہہ کر اپنے لڑکے کو آواز دی، اور کہا کہ اس آدمی کو پانی پلاؤ، میں نے ازراہ تعجب

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵ [2] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۳، معجم الادبار ج ۵ ص ۳۱۰

اس سے پوچھا کہ تم نے حسن نام رکھا ہے؟ اس نے کہا میں نے اپنے لڑکوں کے نام حسن حسین، جعفر رکھے ہیں، بات یہ ہے کہ اہل شام اپنی اولاد کے نام اللہ کے خلفاء کے نام پر رکھتے ہیں حالانکہ ہم لوگ اپنی اولاد کو لعن طعن اور سب و شتم سے یاد کرتے رہتے ہیں، اس لئے میں نے اپنے لڑکوں کے نام اللہ کے دشمنوں کے نام پر رکھے ہیں، اب اگر میں ان کو لعنت و ملامت سے یاد کروں گا تو یہ لعنت اللہ کے دشمنوں پر ہوگی، میں نے کہا کہ میں تم کو اہل شام میں سب سے اچھا سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ اہل جہنم میں تم سے بدتر کوئی نہیں ہے،

مدائنی کہتے ہیں کہ مامون نے یہ واقعہ سن کر کہا

لاجرم قد ابتعث اللّٰہ علیہم — اللہ تعالیٰ ایسی جماعت ضرور پیدا
من یلعن احیاءھم، — کرے گا جو ان کے زندوں اور
واموا تھم، ویلعن من — مردوں پر اور ان کے صلب و رحم
فی اصلاب الرجال وارحام — میں رہنے والوں پر لعنت کرے گی
النساء، یعنی الشیعۃ[1] — یعنی شیعہ،

ابو جعفر احمد بن یوسف متوفی ۲۱۳ھ خلیفہ مامون کے افاضل کتاب (کاتبوں اور سکریٹریوں) میں سے تھا، بڑا ذہین و فطین اور جامع اوصاف، جید الکلام، فصیح اللسان، حسن اللفظ، ملیح الخط اور بہت اچھا شاعر تھا،[2] مامون کا اس کو مدائنی کے بلانے کے لیے حکم دینا کسی خاص وجہ سے تھا، یہاں پر یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ مدائنی کا مولد و منشاء بصرہ عثمانی الفکر تھا، اور اہل بصرہ شیعۂ علیؓ کے مقابلہ میں شیعۂ عثمانؓ بنکر بنو امیہ کے حامی

---

[1] معجم الادبار ج ۵ ص ۳۱۱ [2] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۲۱۶

وطرفدار تھے، شاید خلیفہ مامون کو مدائنی کے عثمانی الفکر ہونے کی خبر ملی ہو، اور اس نے ان کو بلا کر اس بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا ہو، اور مدائنی کے خیالات معلوم کئے ہوں، غالباً مدائنی کے بغداد آنے کے بعد جلد ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا،

معمر بن اشعث سے متعلق علماء کی سربراہی

مدائنی بغداد کے علمی حلقوں میں معزز و محترم مانے جاتے تھے اور ہر طبقہ میں ان کی مقبولیت تھی، معمر بن اشعث نامی ایک قدردان کے یہاں چند علماء رہتے تھے، ان میں مدائنی بھی شامل تھے، بلکہ ان سب کے سربراہ تھے، ابن ندیم نے لکھا ہے کہ معمر بن اشعث کے متعلقین و منتسبین میں حفص الفرد، معمر، ابو سمر، ابوالحسن مدائنی، ابوبکر الاصم، ابو عامر عبدالکریم بن روح چھ اہل علم تھے، ان میں مدائنی متکلم تھے [1]

مدائنی اور ابن عائشہ

مدائنی کے ہم وطن اور معاصر علماء میں مشہور محدث ابو عبدالرحمن عبیداللہ بن محمد تیمی بصری متوفی ۲۲۸ھ عیشی، عائشی اور ابن عائشہ کی نسبت و کنیت سے مشہور ہیں، نہایت ثقہ محدث ہونے کے ساتھ اخبار و انساب اور تواریخ کے بھی زبردست عالم تھے، ان کا شمار بصرہ کے اعیان و سادات میں ہوتا تھا، ان کی سخاوت کا شہرہ عام تھا [2]

ان ہی ابن عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابوالحسن نے میرے پاس آکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شامی علاقوں پر حملہ کا واقعہ بیان کیا اور اسی ضمن میں ان کے رہنما رافع کے بارے میں شاعر کا یہ شعر سنایا ؎

للہ در رافع انی اهتدی فوز من قراقر الی سوی

خمساً اذا سار بها الجیش بکی

مدائنی کے اس شعر میں لفظ الجیش کہتے پر میں نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ اگر یہاں لفظ

[1] الفہرست ص ۱۴۷، [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۴، العبر ج ۱ ص ۴۰۲

جیش ہوتا تو بکی (واحد) کے بجائے بکوا (جمع) کا صیغہ ہوتا، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ مدائنی کا علم کتابوں کے مطالعے کا نتیجہ ہے یعنی انھوں نے اساتذہ سے باقاعدہ نہیں پڑھا ہے،

ابو احمد عسکری نے اپنی کتاب التصحیف میں اس واقعہ کو بیان کر کے لکھا ہے، کہ الجیش بکی صحیح ہے، اور ابن عائشہ کا یہ کہنا کہ لوکان الجیش لکان بکوا وہم ہے الجیش کے لیے بکی جائز ہی، اور اسکو لفظ واحد پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ طفیل غنوی یا اوس بن حجر نے کہا ہے، [1]

ان یک عاراً بالقنان اتیته فراسی، فان الجیش قد فر اجمع

علم نحو و عربیت کا یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ اسم جنس مثلاً جیش، فوج، قوم وغیرہ اپنے لفظ کے لحاظ سے واحد اور معنی کے اعتبار سے جمع ہوتا ہے، اور اس کے لیے واحد اور جمع دونوں کے صیغے اور ضمیریں جائز ہیں، اگر مذکورۂ بالا واقعہ صحیح ہے، اور ابن عائشہ نے مدائنی کی روایت میں اسے غلط قرار دیا ہے تو مدائنی کی خاموشی ان کے علمی وقار اور ابن عائشہ کے احترام کی دلیل ہے،

یہ عہد صدیقی میں ۱۳ھ کا واقعہ ہے، جب کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے قتال مرتدین کے بعد شامی مہمات کی طرف رخ کیا، اور عین التمر کے بعد بنو کلب کے چشمہ قراقر پر یلغار کی، پھر وہاں سے نکل کر بنو کلب کے دوسرے چشمہ سوی پر حملہ کیا، اس مہم میں حضرت خالدؓ کے دلیل اور رہنما رافع بن عمیر طائی تھے، جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے، [2]

للہ در رافع انی اهتدی فوز من قراقر الی سوی

ماء اذا ما رامه الجیش انثنی ما جازها قبلک من انس یری

مدائنی کے آخری دن اور انتقال

مدائنی کے جستہ جستہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش پوش، شریف النفس اور با اخلاق و بامروت انسان تھے، کھلے ذہن و مزاج

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰ [2] فتوح البلدان ص ۱۱۸

مالک تھے، تصنع اور نام ونمود سے متنفر تھے، اپنے محسنوں کے حسن سلوک کا برملا اعتراف کرتے تھے، اپنے بڑوں کے ادب واحترام سے پیش آتے تھے، اس لیئے اہل علم، خلفاء اور امراء میں یکساں مقبول تھے، اور زہد وتقوی کی حد تک اپنی زندگی بسر کرتے تھے، زندگی کے آخری حصہ میں یہ رنگ اور بھی نکھر گیا تھا، اور مسلسل روزہ رکھنے لگے تھے، ان کے تلمیذ حارث بن ابواسامہ کا بیان ہے[1]

انه سرد الصوم قبل موته بثلاث سنين وانه كان قد قارب مائة سنة فقيل له في مرضه: ما تشتهي؟ فقال اشتهي ان اعيش[1]

مدائنی اپنے انتقال سے تین سال پہلے سے مسلسل روزہ رکھتے تھے، حالانکہ انکا سن سو سال کے قریب کا ہو چکا تھا، مرض الموت میں پوچھا گیا کہ آپ کی کیا خواہش ہے؟ تو کہا کہ زندہ رہنا چاہتا ہوں،

اور سمعانی اور یاقوت کی روایت میں تین سال کے بجائے تیس سال روزہ رکھنے کی تصریح ہے[2]،

ان ابا الحسن المدائني سرد الصوم قبل موته بثلاثين سنة

ابوالحسن مدائنی انتقال سے تیس سال پہلے سے مسلسل روزہ رکھتے تھے،

بلکہ ذہبی اور ابن العماد نے مستقل روزہ رکھنے کی تصریح کی ہے،

وكان يسرد الصوم[3]

مدائنی برابر روزہ رکھا کرتے تھے

بڑھاپے کی آخری منزل میں جینے کی تمنا بظاہر روزہ اور دوسرے نیک اعمال کے لیے تھی، حدیث شریف میں اس مومن کے لئے بشارت آئی ہے جسکی عمر میں زیادتی کے ساتھ نیکی میں بھی کثرت ہو،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵ [2] کتاب الانساب ج ۱ ص ۵۱۵ معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۹
[3] العبر ج ۱ ص ۳۹۰ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۵۴

مدائنی کا وصال بغداد میں ان کے محسن اسحق بن ابراہیم کے مکان میں ذی قعدہ ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ کو ہوا، اس وقت انکی عمر نوے سال سے زائد تھی، ذہبی نے العبر میں، ابن العماد نے شذرات الذہب میں ۲۲۴ھ بتایا ہے، جب کہ خطیب، سمعانی، یاقوت اور ذہبی نے میزان الاعتدال میں ۲۲۴ھ اور ۲۲۵ھ ...... دونوں سنین علی اختلاف الروایہ نقل کئے ہیں، ابن ندیم نے صرف ۲۲۵ھ لکھا ہے، ابن ندیم کا بیان ہے،

مات المدائني سنة خمس وعشرين ومائتين، وله ثلاث وتسعون سنة في منزل اسحق بن ابراهيم الموصلي وكان منقطعا اليه[1]

مدائنی، ۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اس وقت انکی عمر ترانوے (۹۳) سال تھی، انکا انتقال اسحق بن ابراہیم موصلی کے مکان میں ہوا، ان کے موصلی سے خصوصی تعلقات تھے،

انتقال کے وقت مدائنی کی عمر کے بارے میں سب ہی تذکرہ نویس ترانوے (۹۳) سال کی تصریح کرتے ہیں، جب کہ خود مدائنی کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۱۳۵ھ میں ہوئی تھی، اس کی رو سے ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں انتقال کے وقت ان کی عمر نوے (۹۰) سال کی ہونی چاہیئے۔

اقران ومعاصرین کی نظر میں

مدائنی ابتداء میں محدث کی حیثیت سے ابھرے اور انتہا میں اخباری کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور علمائے حدیث کی طرح علمائے اخبار واحداث میں ثقہ ومستند تسلیم کئے گئے اور ان کے معاصرین نے ان کے صدق وثقاہت کا برملا اعتراف واظہار کیا، گزر چکا ہے کہ ایک مرتبہ مدائنی حافظ ابوخیثمہ زہیر بن حرب متوفی ۲۳۴ھ،

---

[1] الفہرست ص ۱۴۷

امام یحییٰ بن معین متوفی سنہ ۲۳۳ھ اور امام مصعب بن عبداللہ زبیری متوفی سنہ ۲۳۶ھ کی مجلس سے گزرے تو امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین نے ان کے بارے میں تین بار ثقہ ثقہ ثقہ فرمایا، اور حاضرین نے خاموشی سے اس کی تائید و تصدیق کی۔

مذکورۂ بالا واقعہ کے راوی مدائنی کے شاگرد احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب ہیں ان کا بیان ہے کہ

قال لی یحیی بن معین غیر مرۃ اکتب عن المدائنی کتبہ۔

ابن معین نے بارہا مجھ سے کہا کہ تم مدائنی کی کتابیں لکھا کرو اور ان سے ان کی روایت کرو۔

امام ابو قلابہ رقاشی (عبدالملک بن محمد بصری متوفی سنہ ۲۷۶ھ) کا بیان ہے کہ میں ابو عاصم النبیل ضحاک بن مخلد بصری متوفی سنہ ۲۱۲ھ کے سامنے ایک حدیث بیان کی انھوں نے کہا کہ یہ حدیث کس کی سند سے ہے، اور اس کے راوی کون لوگ ہیں؟ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے، میں نے کہا کہ اس کی سند نہیں ہے، البتہ اسے ابوالحسن مدائنی نے مجھ سے بیان کیا ہے، ابو عاصم النبیل نے یہ سنتے ہی کہا۔

سبحان اللہ ابو الحسن اسناد[1]

سبحان اللہ ابوالحسن خود ہی سند ہیں،

یہ چاروں ائمۂ دین اپنے دور میں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب تھے، انھوں نے مدائنی کو سند و ثقہ قرار دیکر ان کے علم و فن کے معتبر و مستند ہونے کی شہادت دی ہے، البتہ ان کے ایک معاصر محدث و مورخ ابن عائشہ (عبیداللہ بن محمد بصری متوفی سنہ ۲۲۸ھ) نے ان سے ایک شعر سن کر اپنے خیال کے مطابق ایک غلطی نکالی اور اسی کی بنا پر ان کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵۔

بارے میں کہا۔

وعلمت ان علمہ من الصحف[1]

میں سمجھ گیا کہ مدائنی کا علم کتابی ہے (درسی نہیں ہے)

مطلب یہ ہے کہ ابن عائشہ کے خیال میں مدائنی نے شیوخ و اساتذہ سے روایت کرنے کے بجائے انکی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور اپنے طور پر ان کو سمجھا ہے، مگر اس واقعہ کے ناقل ابو احمد عسکری نے اسکو ابن عائشہ کا وہم قرار دیکر مدائنی کی تائید و توثیق کی ہے، مشہور اخباری عالم ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی متوفی سنہ ۲۴۵ھ مدائنی کے متاخر الوفاۃ معاصر ہیں، انھوں نے کتاب المحبّر میں (ص ۵۲) " قال المدائنی " کہہ کر روایت کی ہے،

مشہور امام نحو ثعلب (ابو العباس احمد بن یحییٰ نحوی متوفی سنہ ۲۹۱ھ) اگرچہ مدائنی کے معاصرین میں سے ہیں، مگر انھوں نے اپنے ابتدائی ایام میں مدائنی کا آخری زمانہ پایا ہے، ان کا قول ہے،

من اراد اخبار الجاھلیۃ فعلیہ بکتب ابی عبیدۃ ومن اراد اخبار الاسلام فعلیہ بکتب المدائنی،[2]

جو شخص زمانۂ جاہلیۃ کی تاریخ معلوم کرنا چاہے وہ ابو عبیدہ کی کتابیں پڑھے اور جو شخص زمانۂ اسلام کی تاریخ معلوم کرنا چاہے وہ مدائنی کی کتابیں پڑھے۔

علامہ ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ اخباری متوفی سنہ ۲۱۰ھ اخبار و تواریخ کے مشہور عالم و مصنف ہیں، قریش کی شاخ قبیلہ بنو تیم کے غلام ہیں، خاندان فارس کا تھا، مدائنی کے معاصر ہیں، انھوں نے بھی عجم کی فتوحات پر کتاب فتوح خراسان، کتاب فتوح آرمینیہ اور

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵

کتاب فتوح الاهواز تصنیف کی ہے،[1]

محدثین کے نزدیک مدائنی کا مقام و مرتبہ

مدائنی محدثین کے زمرے سے نکل کر علمائے اخبار و احداث میں شامل ہوگئے تھے، اس لئے بعد میں محدثین نے ان کو اخباری کی حیثیت دیدی، وہ خود بھی حدیث کی روایت کے بجائے تواریخ و انساب کی تدوین و روایت میں مصروف ہوگئے، ابن عدی نے "الکامل فی الضعفاء" میں ان کے بارے میں لکھا ہے،

لیس بالقوی فی الحدیث	مدائنی حدیث میں قوی نہیں ہیں،
وھو صاحب اخبار، قل ماله	وہ صاحبِ اخبار ہیں، ان کے یہاں
من الروایات المسندة[2]	مسند احادیث قلیل ہیں،

ذہبی نے ابن عدی کا یہ قول میزان الاعتدال میں صرف نقل کر دیا ہے، البتہ انھوں نے "المغنی فی الضعفاء" میں اس کے ساتھ اپنی یہ رائے بھی لکھی ہے،

المدائنی الاخباری صدوق	مدائنی اخباری صدوق ہیں ابن عدی
قال ابن عدی لیس بالقوی[3]	نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں ہیں،

بخلاف اس کے ذہبی نے کتاب العبر میں صرف یہ لکھا ہے،

وثقه ابن معین وغیره[4]	یحیی بن معین وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے،

ابن العماد نے بھی شذرات الذہب میں یہی لکھا ہے،[5] اور یاقوت نے لکھا ہے

وکان ثقة اذا حدث عن	مدائنی جب ثقات سے روایت کریں
الثقات،[6]	تو وہ ثقہ ہیں،

۱؎ الفہرست ص ۱۰۹، ۲؎ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۵۳ ۳؎ المغنی فی الضعفاء ج ۲ ص ۴۵۴
۴؎ العبر ج ۱ ص ۳۹۱ ۵؎ شذرات الذہب ج ۲ ص ۵۴ ۶؎ معجم الادباء ج ۵ ص ۳۱۰

محدثین اور ائمۂ جرح و تعدیل کے یہ آراء و اقوال مدائنی کے حق میں احادیث کی روایت کے بارے میں ہیں، جن میں ان کو ثقہ، سند، صدوق بتایا گیا ہے اور چونکہ انھوں نے اخبار و احداث کو اپنا خاص موضوع بنالیا تھا، اس لئے احادیث و آثار کی روایت نہیں کی، اور نہ ہی مسند احادیث کا اہتمام کیا، یہی وجہ ہے کہ محدثین کے نزدیک وہ اخباری رہے، اور اس بارے میں ان کی ذات ثقہ، صدوق، سند اور قابلِ اعتماد ہے، صرف ان کی ایک مسند حدیث میزان الاعتدال میں یوں آئی ہے،

روی عن جعفر بن هلال،	مدائنی نے جعفر بن ہلال سے روایت کی،
عن عاصم الاحول عن ابی	انھوں نے عاصم الاحول سے، انھوں نے
عثمان عن ابی اسامة قال!	ابوعثمان سے، انھوں نے ابواسامہ سے
کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یحملنی	کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور حسن بن علی کو
والحسن بن علی ویقول!	اٹھاتے تھے اور فرماتے تھے اے اللہ میں
اللهم انی احبهما فاحبهما۔	ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان کو محبوب رکھ،

مدائنی نے فن تاریخ کو اپنی علمی سرگرمی کا محور بناکر اس کی روایت و سند میں محدثانہ انداز اختیار کیا، اور تدلیس یا رواۃ کی جہالت سے بچنے کی کوشش کی، چنانچہ ابوالیقظان کے بارے میں تصریح کی ہے کہ ان سے روایت و سند میں انکا نام کئی طرح سے لیتا ہوں اور ابوالیقظان، سحیم ابن حفص، عامر بن حفص، عامر بن ابومحمد، عامر بن اسود، سحیم بن اسود، عبیداللہ بن حفص، اور ابواسحق سے میری مراد ابوالیقظان ہی ہوتے ہیں،[1]

۱؎ الفہرست ص ۱۳۸،

مدائنی اخباری و مورخ — مدائنی کے شیوخ و اساتذہ میں اکثر ائمہ حدیث ہیں جن میں سے بعضوں نے حدیث کے ساتھ سیر و مغازی اور تواریخ سے بھی اعتنا کیا، خاص طور سے قاضی علی بن مجاہد کابلی متوفی ۱۸۰ھ صاحب المغازی، موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ صاحب المغازی، ابومعشر سندی مدنی متوفی ۱۷۰ھ صاحب المغازی، ابوبکر ہذلی بصری متوفی ۱۶۷ھ عالم تواریخ و انساب، ابوالیقظان متوفی ۱۹۰ھ عالم انساب عرب، موخر الذکر کے علاوہ یہ سب حضرات علم حدیث کے شیوخ ہونے کے ساتھ تواریخ کے مستند ائمہ ہیں، اور مدائنی کی طرح علی بن مجاہد کابلی اور ابومعشر سندی، طبقۂ موالی سے ہیں، ان کا آبائی و نسلی تعلق بھی مدائنی کے آبائی و نسلی وطن سے ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی شیوخ سے متاثر ہو کر مدائنی کا اشہب قلم تواریخ و انساب، اخبار و احداث اور غزوات و فتوحات کے میدان کی طرف مڑ گیا، اور اسکی وسعت اور رنگینی نے باہر نکلنے نہ دیا، اسی لئے مدائنی کے تلامذہ کی اکثریت ائمۂ تاریخ کی ہے، ان کا تمام تر تصنیفی سرمایہ اخبار و احداث پر مشتمل ہے، اور وہ بعد میں اخباری کی نسبت سے مشہور ہوئے، ان کے سب سے پہلے تذکرہ نگار ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے کتاب المعارف میں انکا ذکر علمائے تاریخ میں کر کے لکھا ہے،

والاغلب علیہ روایۃ الاخبار[1]	مدائنی پر اخبار کی روایت کا غلبہ ہے،

ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب متوفی ۲۹۱ھ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے،

من اراد اخبار الجاھلیۃ فعلیہ بکتب ابی عبیدۃ،	جو شخص زمانۂ جاہلیت کی تاریخ پڑھنا چاہے، اس کو ابوعبیدہ کی کتابیں

[1] المعارف ص ۲۳۴

ومن اراد اخبار الاسلام فعلیہ بکتب المدائنی۔	دیکھنی چاہئیں، اور جو شخص اسلامی تاریخ پڑھنا چاہے اسکو مدائنی کی کتابیں پڑھنی چاہئیں

خطیب اور سمعانی نے لکھا ہے۔

وکان عالماً بایام الناس واخبار العرب وانسابھم۔ عالماً بالفتوح والمغازی، وروایۃ الشعر صدوقاً فی ذالک[1]۔	مدائنی ایام ناس، اخبار عرب اور انساب عرب کے عالم تھے اسی طرح فتوح و مغازی کے عالم اور شعر کے راوی تھے، ان علوم میں صدوق و ثقہ تھے،

ذہبی نے العبر میں ان کا تعارف الاخباری، صاحب التصانیف، والمغازی والانساب کے الفاظ سے کرایا ہے، اور میزان الاعتدال میں الاخباری صاحب التصانیف اور المغنی فی الضعفاء میں الاخباری صدوق لکھا ہے، سمعانی نے کہا ہے، وھو صاحب الکتب المصنفۃ اور شذرات الذہب میں بھی الاخباری، صاحب التصانیف، والمغازی والانساب ہے۔ الغرض مدائنی کے تذکرہ نویسوں نے ان کو اخبار و احداث سیر و مغازی، انساب عرب، اشعار عرب اور فتوحات میں صاحب الکتب المصنفہ اور ان علوم کا امام مانا ہے، اور ان ہی میں ان کو شہرت و ناموری ملی،

تاریخی تصانیف — مدائنی کی زندگی کے ابتدائی ۶۵ سال دوسری صدی میں اور آخری پچیس (۲۵) سال تیسری صدی کے ربع اول میں گزرے، یہ زمانہ اسلامی علوم و فنون کی تالیف و تدوین کا دور شباب ہے، اس میں ائمۂ علم و فن نے اپنے زمانہ تک کے علوم و فنون کو سینوں سے

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۵، کتاب الانساب ج ۲ ص ۵۱۵

سفینوں میں منتقل کیا، چنانچہ فن تاریخ میں بھی خوب خوب اور طرح طرح سے کام ہوا در حقیقت
اسی دور کی تصانیف بعد کے مصنفین کا ماخذ بنیں اور ان کو امہات الکتب کا درجہ ملا۔

اس دور میں مدائنی کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین میں فن تاریخ کے عظیم مصنف پیدا
ہوئے مثلاً ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی متوفی ۱۵۷ھ صاحب کتاب فتوح العراق جن کے بارے
میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے، وکان صاحب اخبار وانساب، والاخبار علیہ اغلب" ہشام
بن محمد بن سائب کلبی متوفی ۲۰۴ھ صاحب کتاب الجمہرۃ فی النسب (وھو من محاسن
الکتب فی ہذا الفن (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۲) انھوں نے تاریخ وانساب میں ڈیڑھ سو سے
زائد کتابیں لکھیں،

محمد بن عمر واقدی متوفی ۲۰۷ھ صاحب کتاب فتوح العراق وکتاب التاریخ وکتاب المغازی،

ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ متوفی ۲۱۰ھ یا ۲۱۱ھ،

محمد بن سعد بغدادی کاتب الواقدی متوفی ۲۳۰ھ صاحب الطبقات،

زبیر بن بکار متوفی ۲۵۶ھ صاحب کتاب جمہرۃ نسب قریش واخبارہا۔

مصعب بن عبداللہ زبیری متوفی ۲۳۶ھ۔

خلیفہ بن خیاط بصری متوفی ۲۴۰ھ صاحب الطبقات والتاریخ۔

ابو الحسن احمد بن یحییٰ بلاذری بغدادی متوفی ۲۸۰ھ صاحب انساب الاشراف
وفتوح البلدان۔

احمد بن اسحٰق بن جعفر یعقوبی صاحب کتاب التاریخ وکتاب البلدان۔

عمر بن شبہ بصری متوفی ۲۶۳ھ اخباری صاحب التصانیف۔

محمد بن صالح بن مہران بصری متوفی ۲۵۲ھ صاحب کتاب الدولہ۔

یہ تمام علمائے تاریخ وانساب صاحب تصانیف کثیرہ ہیں خصوصاً غزوات وفتوحات پر
انھوں نے چھوٹی بڑی کتابوں کے انبار لگائے ہیں جن میں بلاد اسلامیہ کی فتوحات کی طرح ہندوستان
کی فتوحات کا بھی ذکر ہے، چنانچہ تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ یعقوبی اور بلاذری کی فتوح البلدان
سے اگر ہندوستان کی اسلامی تاریخ مرتب کی جائے تو اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے، واقدی نے
اخبار فتوح بلاد السند نامی اپنی کتاب یا کسی کتاب کے باب میں حضرت امیر معاویہؓ کے امیر
سندھ عبداللہ بن سوار عبدی کی خدمت میں راجہ قیقان کو تحفۃً دہریہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے،
اور ابن سعد نے الطبقات الکبریٰ میں حضرت ربیع بن صبیح بصری متوفی ۱۶۰ھ کے ہندوستان
میں انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خبر مجھے بصرہ کے ایک شیخ نے دی ہے، جو ان کے ساتھ
موجود تھے،

خلیفہ نے ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ کی روایت سے محمد بن قاسم کی ولایت سندھ کا ذکر کرکے
عون بن حسن بن کہمس بصری سے ان کے والد کے غزوۂ سندھ میں شریک ہونے کا ذکر کیا ہے،
اور بلاذری نے فتوح السند کے باب میں ہشام بن الکلبی سے روایت کی ہے اگر ان قدیم
علمائے تاریخ کی کتابیں ناپید نہ ہوئی ہوتیں تو ہم کو ان سے ہندوستان کے بارے میں نہایت
مستند نادر اور اہم معلومات حاصل ہوتیں، اس سلسلہ میں اس دور کے مشہور ادیب
وفلسفی اور صاحب طرز مصنف جاحظ (ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب بصری متوفی ۲۵۵ھ)
کا ذکر بھی ضروری ہے، جس نے کتاب الحیوان، کتاب البیان والتبیین اور دیگر کتب ورسائل
میں ہندوستان کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات درج کی ہیں، جن کا تعلق اگرچہ یہاں کی فتوحات
وغزوات سے نہیں ہے، مگر یہاں کے بارے میں اس انداز کی معلومات دوسرے مصنفین کی
کتابوں میں نہیں ہیں،

اسی طبقہ میں مدائنی کا بھی شمار ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تاریخ وانساب اور فتوح کی مختلف الانواع تصانیف کثیرہ میں اپنے طبقہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور اس کارواں کے سرخیل نظر آتے ہیں، ابن ندیم نے الفہرست میں ص ۱۴۸ سے ص ۱۵۲ تک پانچ صفحات میں ان کی تاریخی تصانیف کے نام درج کئے ہیں اور یاقوت نے معجم الادباء میں ابن ندیم کے حوالہ سے ان کو نقل کیا ہے، جن کی مجموعی تعداد دوسو سترہ (۲۱۷) سے زائد ہے، ابن ندیم نے حسب ذیل عنوانات کے ماتحت مدائنی کی کتابوں کے نام لکھے ہیں،

(۱) کتبہ فی اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۹	کتابوں کے نام
(۲) کتبہ فی اخبار قریش	۳۱	"
(۳) کتبہ فی اخبار مناکح الاشراف واخبار النساء	۲۳	"
(۴) کتبہ فی اخبار الخلفاء	۷	"
(۵) کتبہ فی الاحداث	۲۶	"
(۶) کتبہ فی الفتوح	۳۷	"
(۷) کتبہ فی اخبار العرب	۱۰	"
(۸) کتبہ فی اخبار الشعراء	۳۲	"
(۹) ومن کتبہ المولفۃ	۴۵	"

اور کتبہ فی الفتوح کے ذیل میں خالص اسلامی ہند کی تاریخ پر ان تین کتابوں کے نام ہیں (۱) کتاب ثغر الہند (۲) کتاب عمال الہند (۳) کتاب فتح مکران۔[1] افسوس کہ مدائنی کی دوسو سے زائد کتابوں میں سے کوئی کتاب آج موجود نہیں ہے،

[1] الفہرست ص ۱۵۰

ورنہ ان کی تصانیف خصوصاً مذکورہ تینوں کتابوں سے اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ کا نہایت مستند ومعتبر ذخیرہ ہمارے پاس ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ مدائنی اسلامی ہند کے سب سے پہلے مورخ اور اپنے معاصر مورخوں میں ہندوستان کی تاریخ کے سب سے بڑے عالم ومصنف تھے، جیسا کہ ابن ندیم نے ابومخنف لوط بن یحییٰ متوفی ۱۵۷ھ کے تذکرہ میں علمائے تاریخ کا یہ قول نقل کیا ہے،

قالت العلماء: ابومخنف بامر العراق واخبارها وفتوحها يزيد على غيره، والمدائني بامر خراسان والهند وفارس، والواقدي بالحجاز والسيرة وقد اشتركوا في فتوح الشام۔[1]

علماء نے کہا ہے کہ ابومخنف عراق کے امور واخبار اور فتوحات کا دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں، اور مدائنی خراسان وہند اور فارس کے معلومات میں دوسروں پر فائق ہیں اور واقدی حجاز اور سیر ومغازی کے علم میں دوسروں سے آگے ہیں، اور شام کی فتوحات میں سب مشترک ہیں،

یہی وجہ ہے کہ مدائنی کے تلامذہ بھی اس بارے میں اپنے طبقہ میں ممتاز ہیں، اور اپنی کتابوں میں ہندوستان کی فتوحات وغیرہ کا تذکرہ کثرت سے کرتے ہیں، خلیفہ، بلاذری اور یعقوبی کی کتابیں خوش قسمتی سے زمانہ کی غارت گری سے محفوظ رہ گئی ہیں، جو اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں، مدائنی نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر ان تین مستقل کتابوں کے علاوہ اپنی دیگر تصانیف میں بھی بہت کچھ لکھا ہوگا، اخبار خلفاء اور اخبار عرب کے سلسلہ کی کتابوں میں خصوصاً کتاب اخبار ثقیف اور کتاب فتوح خراسان میں یہاں کے حالات ہوں گے،

[1] الفہرست ص ۱۳۱

بعد کے مورخوں نے مدائنی کی روایات اپنی کتابوں میں درج کر کے ان کے تاریخی سرمایہ کا کچھ حصہ محفوظ کر لیا ہے، طبری نے تقریباً پانچ سو روایات مدائنی کی بیان کی ہیں، جن کا تعلق زیادہ تر خراسان اور عراق کی فتوحات سے ہے، ایک مقام پر محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ کے سلسلہ میں مدائنی کی روایت سے بلواث کلبی مدائنی کا ایک واقعہ لکھا ہے، بلاذری نے انساب الاشراف میں مدائنی کے حوالہ سے بہت سے واقعات و روایات کو بیان کیا ہے، اور فتوح البلدان میں کم از کم پچیس[25] مقامات پر مدائنی کی روایات درج کی ہیں، اور اس کے باب فتوح السند کی ابتداء مدائنی کی روایات سے یوں کی ہے، اخبرنا علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف، اس کے بعض مقامات میں تصدیق یا اختلاف کی غرض سے ابن الکلبی، ابوبکر ہذلی، اور منصور بن حاتم نحوی کے بیانات بھی نقل کئے ہیں، یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سندھ کے حالات درج کئے ہیں، مگر اس میں مدائنی کے نام سے کوئی روایت نہیں ہے، البتہ پوری کتاب میں بعض مقامات پر مدائنی کا نام موجود ہے،

خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں پچاس سے زائد مقامات پر مدائنی کی روایات ان کے نام کے ساتھ درج کی ہیں، مگر ہندوستان کے واقعات میں ان کا نام ایک جگہ بھی نہیں ہے،

چچ نامہ محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ پر مشہور کتاب ہے، اس کے محرف و مصحف مطبوعہ نسخہ میں مدائنی کی تیرہ[13] روایات ہیں، اور دو روایتیں محمد بن حسن، اور محمد بن حسن مدنی کے نام کی ہیں، یہ غالباً ابوالحسن علی بن محمد مدائنی کی تحریفی شکل ہے،

شاہنامۂ فردوسی میں ہجو وطنز کے مقامات

از، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور پاکستان

ایران کا عظیم رزم گو شاعر استاد ابوالقاسم منصور بن حسن فردوسی ۳۲۹-۳۳۰ھ[1] (۹۴۱-۹۴۲ء) کے درمیان طوس کے ایک قصبے باژ میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق طوس کے ایک زمین دار خاندان سے تھا، خود بھی مال و جائداد کا مالک تھا۔

عہد سامانی کے مشہور شاعر دقیقی نے جسے ۳۶۸-۳۶۹ھ/۹۷۸-۹۷۹ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اپنے قتل سے کچھ عرصہ قبل شاہنامۂ ابومنصوری نظم کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن ہنوز ایک ہزار اشعار سے بیشتر نہ کہہ پایا تھا کہ مذکورہ حادثے کا شکار ہو گیا، فردوسی نے اس کے اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ۳۷۰-۳۷۱ھ[2] میں شاہنامہ لکھنا شروع کیا اسے پر اس کے ۳۱ یا ۳۲ سال صرف ہوئے۔ چونکہ شاہنامہ کی تکمیل سے کوئی آٹھ نو برس پہلے ہی وہ محمود غزنوی کے دربار سے منسلک ہو گیا تھا، اس لئے اس نے شاہنامہ کا انتساب سلطان ہی کے نام کر دیا۔ لیکن بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر اس سے دل آزردہ اور پریشان ہو کر غزنین سے خراسان اور وہاں سے طبرستان کے آل باوند کے سپہبد شہریار کی خدمت میں جا پہنچا اور وہیں، جیسا کہ نظامی عروضی کا کہنا ہے "محمود را ہجا کرد و دیباچہ بیتی صد و بر شہریار خواند"[3] اس کی خواہش تھی کہ شاہنامہ کو اب شہریار ہی کے نام

---

[1] بقول حافظ محمود شیرانی ۳۲۲-۳۲۳ھ تنقید شعر العجم ص ۸۰، [2] بقول شفق ۳۶۵ھ [3] چہار مقالہ ص ۸۰ (متن)

معنون کر دے لیکن شہریار نے اتفاق نہیں کیا، اور کہا کہ محمود میرا آقا ہے، تو شاہنامہ کو اسی کے نام منسوب رہنے دے، اور اس کی ہجو میرے سپرد کر دے تاکہ میں اسے دھو ڈالوں، اور اس کے عوض تجھے کچھ مال عطا کروں، محمود خود ہی تجھے بلا لے گا، اور تجھ کو راضی کر دے گا، اور یوں تیری محنت رایگاں نہ جائے گی۔[1] بظاہر فردوسی نے یہ ہجو ایک لاکھ درہم کے عوض شہریار کے سپرد کر دی اور وہاں سے خراسان لوٹ گیا، جہاں اپنی زادگاہ میں مقیم ہوا تا آنکہ ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ[2] میں عالمِ بقا کو سدھارا اور وہیں مدفون ہوا۔[3]

ایران کے مشہور محقق و ادیب ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا کہنا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ، سلطان محمود غزنوی کے نام معنون کرنے کے بعد بھی مسلسل اس میں ترمیم اور تصحیح جاری رکھی اور اس طرح مرنے سے قبل بعض اشعار اس میں سے خارج کر دیئے، اور بعض میں کچھ تبدیلی کی۔[4]

ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے شاہنامہ کی ادبی لطافتوں اور خوبیوں کو سراہتے ہوئے اسے تواریخ کا بادشاہ (شاہِ نامہ ہا) کہا ہے۔ ان کے مطابق فردوسی نے نظم شاہنامہ میں جو منفرد انداز اختیار کیا ہے اس کی بنا پر وہ کیا گذشتہ اور کیا آیندہ شعرا، سب کا استاد ہے اور کوئی بھی اس ضمن میں اسکی برابری نہیں کر سکتا۔[5]

لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن کی رائے اس بارے میں کچھ مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ فردوسی کی شہرت شاہنامہ کی بدولت ہے اور مشرقی و مغربی نقادوں نے متفقہ طور پر اس عظیم ادبی مثنوی کی قدر و قیمت کو سراہا ہے، لیکن میں بڑی ہی شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں ہرگز ان نقادوں کی اس پُرشور و شوق ستایش و تحسین میں ان کا ہم آواز نہیں ہو سکا، میرے خیال کے

۱؎ چہار مقالہ ص ۸۱ ۲؎ حماسہ عربی در ایران ص ۱۶۶، دولت شاہ نے ۴۱۱ھ لکھا ہے ملاحظہ ہو ص ۳۰ ۳؎ صفا جلد اول ص ۵۰۴ بعد، شعر العجم جلد ۱ ص ۷۰ بعد، شفق ص ۱۰ بعد ۴؎ حماسہ سرائی ... ص ۱۸۴ ۵؎ شفق ص ۹۲

مطابق شاہنامہ کو ایک لحظہ کے لیے بھی معلقات عربی کے برابر اور ہم پلہ نہیں سمجھا جا سکتا ..... بحیثیت مجموعی یہ کہ زیبائی، ذوق، احساس فنی، لطف مضمون اور حسن بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی کسی بھی بہترین عشقیہ، غنائی اور علمی نظم کے پایہ کو نہیں پہنچی ..... اسمیں جو تشبیہات استعمال کی گئی ہیں وہ کچھ زیادہ ہی یکسانیت و یکرنگی کا شکار ہیں۔[1]

شاہنامہ میں طنز و مزاح اور براہ راست ہجو کے اشعار کم ہی نظر آتے ہیں، ہاں بالواسطہ طور پر یعنی داستان میں کسی ایک کردار کے ذریعہ دوسرے کردار کی ہجو پر مبنی اشعار ضرور مل جاتے ہیں، ڈاکٹر صفا کا قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ فردوسی ایران سے اپنی والہانہ محبت اور غیر ایرانی عناصر سے تمام تر دشمنی کے باوجود شاہنامہ میں ایک بے غرض اور غیر جانبدار شخص ہے، اور شاہنامہ میں عربوں یا ترکوں، یونانیوں اور مختلف مذاہب مثلاً زرتشتی اور اسلام وغیرہ کو جو اس نے کوئی گالی دی یا برا بھلا کہا ہے تو یہ یا تو کسی متن سے منقول ہے یا پھر کسی کردار کی زبانِ حال سے، جس نے مذکورہ زبان میں بات کی اور بس۔[2] حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بھی کچھ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے، اس ضمن میں وہ فردوسی کا زبردست دفاع کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں: "بحیثیت مورخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہنچائے ہیں، عیناً ذکر کر دے، مثلاً ایک معاندِ اسلام رستم سپہ سالار یزدجرد نے جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا، اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لیے کہا۔

زیان کسان از پے سود خویش　　　بجویند و دین اندر آرند پیش .....

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کر دیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں مستوجبِ تشنیع ٹھہرایا جائے ..... ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے کہ عرب کی مذمت کے اشعار:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار　　　عرب را بجائے رسید است کار .....

۱؎ براؤن (ترجمۂ فارسی) جلد ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷ ۲؎ حماسہ سرائی در ایران ص ۱۸۷

سب کو یاد رہے لیکن وہ اشعار جو ان کے جواب میں ایرانی سفیر کو خطاب کرکے حضرت سعد بن ابی وقاص کی زبان سے فردوسی نے ادا کیے کبھی شرمندۂ التفات نہ ہوئے ....[1] حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو بقول فروغی مرحوم بڑا ہی صاحب اخلاق، بلند نظر، نرم دل اور حس لطیف و ذوق سلیم اور طبع حکیم کا مالک ہو،[2] اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی زبان کو ہجو و بدگوئی، فحش و دشنام اور رکاکت سے آلودہ کرے البتہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ایک طویل ہجو اس سے منسوب کی گئی ہے، جس کے بارے میں مرحوم فروغی لکھتے ہیں کہ فردوسی کے معاملے میں جو عجیب و غریب تصرفات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے سلطان محمود غزنوی کی ہجو کہی، حالانکہ نظامی عروضی (جو اس کا قریب العہد ہے) کے مطابق وہ ہجو دھو ڈالی گئی تھی اور صرف چند اشعار محفوظ رہ گئے ہونگے لیکن اس کے باوجود شاہنامہ کے بعض نسخوں میں سو سے بھی زیادہ اشعار پر مشتمل ہجو محمود دیکھنے میں آتی ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ہجو کے بیشتر اشعار ہیں تو فردوسی ہی کے لیکن شاہنامہ کے مختلف مقامات پر اور داستانوں میں آئے ہیں، دراصل جن مفاد پرستوں کی خواہش یہ رہی ہے کہ یہ ہجو نامہ برقرار اور تمام و کمال رہے، انھوں نے شاہنامہ سے چن چن کر ایسے اشعار نکال لیے جو کسی نہ کسی طرح محمود کی ہجو سے مناسبت رکھتے تھے، اور یوں ان اشعار کو مذکورہ ہجو کی صورت دے دی۔[3]

---

[1] فردوسی پر چار مقالے، حاشیہ ص ۱۳۶ [2] خلاصہ شاہنامہ ص ۱۹۔ مرحوم شیرانی لکھتے ہیں، فردوسی .... ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا، بلند ہمت اتنا کہ تکلیف اور ظلم یا اور کسی قسم کی بد نصیبی کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتا۔ اگرچہ سلطان کی ناقدردانی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا تھا تاہم کہا جاسکتا ہے کہ وہ رکیک ہجو لکھ کر انتقام لینے کے ناقابل تھا، (فردوسی پر چار مقالے ص ۳۶)

[3] خلاصۂ شاہنامہ، جز د: ۱۰، ص ۵۵ نیز ملاحظہ ہو چہار مقالہ ص ۱۷۱ غزنوی دربار کے ایک مشہور شاعر عثمان

شاہنامہ کے مختلف نسخوں میں اس ہجو کے اشعار کی تعداد مختلف ہے، نظامی عروضی کے مطابق اس کے صرف چھ اشعار باقی رہ گئے،[1] قاضی نور اللہ شوستری نے انہتر اشعار بتائے ہیں،[2] جبکہ شاہنامہ مطبوعہ نولکشور میں ان کی تعداد ایک سو ایک ہے،[3] وقس علیٰ ھذا۔ نظامی عروضی نے یہ چھ اشعار نقل کئے ہیں۔

مرا غمز کردند کآن پرُ سخن   بمہر نبی و علی شد کہن

اگر مہر شان من حکایت کنم   چو محمود را صد حمایت کنم

پرستار زادہ نیاید بکار   دگر چند باشد پدر شہریار

ازین در سخن چند رانم ہمی   چو دریا کرانہ ندانم ہمی

بہ نیکی بند شاہ را دستگاہ   وگرنہ مرا برنشاندی بگاہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۰) مختاری نے اپنی مثنوی "شہریار نامہ" میں اس ہجو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چو مختاری آن باور داستان   بنام تو گفت ای شہ راستان

گرم ہدیہ بخشی درین بارگاہ   بہ پیش بزرگان با عز و جاہ

شوم شاد و افزون شود جاہ تو   ہمان مدح گویم بدرگاہ تو

دگر ہدیہ ندہی ایا شہریار   نرنجم کہ ہستی خداوندگار

زبان من از ہجو کوتاہ باد   ہمیشہ ثنا گوی این شاہ باد

(دیوان عثمان مختاری ص ۷۳۳)

اسی طرح نظامی گنجوی نے سکندر نامہ میں اپنے ممدوح کو خطاب کرتے ہوئے اس ہجو کی طرف اشارہ کیا ہے، ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۳۰۹۔ اسی ضمن میں نظامی گنجوی ہی کے اشعار کے لیے ملاحظہ ہو فردوسی پر چار مقالے ص ۴۰، ۴۱۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بھی تفصیلی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مذکورہ ہجو کے زیادہ تر اشعار فردوسی ہی کے ہیں، اور شاہنامہ کی مختلف داستانوں میں آئے ہیں جنھیں بعض غرض مند لوگوں نے یکجا جمع کر کے انہیں ہجو محمود کے نام سے مشہور کر دیا، پھر یہ فردوسی کی شرافت طبع کے بھی خلاف تھا کہ وہ سلطان محمود کی ہجو کہتا جس کی اس نے اپنی ضخیم مثنوی میں کئی جگہ تعریف و توصیف کی ہے (فردوسی پر چار مقالے ص ۲۵-۹۲)

چو اندر تبارش بزرگی نبود | ندانست نام بزرگاں شنود[19]

اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

یکی بندگی کردم اے شہریار | کہ ماند ز تو در جہاں یادگار . . .
اگر شاہ را شاہ بودے پدر | بہ سر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے . . . | مرا سیم و زر تا بہ زانو بدے
پرستار زادہ نیاید بکار | وگر چند دارد پدر شہریار
ازاں گفتم این بیت ہائے بلند | کہ تا شاہ گیرد ازین کار پند
کہ شاعر چو رنجد، بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں، ملک کے ملک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے، آج تک قائم ہیں اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔[20]

شیرانی مرحوم نے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ایک طویل بحث کے بعد اس ہجو کو اس طرح فرضی اور ساختہ قرار دیا ہے کہ اپنے مقالے کے آخر میں اس کے بعض اشعار اور شاہنامہ کے مختلف مقامات کے بعض اشعار آمنے سامنے رکھ دیئے ہیں، اور شاہنامہ کے ان مقامات کے عنوانات بھی دے دیئے ہیں، تاکہ سارا معاملہ بخوبی روشن ہو جائے۔[21]

(حاشیہ ص ۲۲۲) [19] چہار مقالہ ص ۸۰ [20] مجالس المومنین بحوالہ فردوسی پر چار مقالے ص ۴۸
[21] شاہنامہ جلد اول ص ۲۳ (حاشیہ ص ۲۲) [22] چہار مقالہ ص ۸۱ [23] شعر العجم جلد اول ص ۱۰۵، ۱۰۶ شبلی نے ۱۵ اشعار دیے ہیں [24] ملاحظہ ہو فردوسی پر چار مقالے ص ۹۱ - ۹۷۔

اب ذرا شاہنامہ کے ایسے مقامات کا ذکر ہو جائے جن میں مختلف کرداروں نے ہجو یا طنز سے کام لیا ہے،

ایران کے بادشاہ یزدگرد سوم کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری میں ایک لشکر ایران کی طرف روانہ کیا، جب یہ لشکر ایران پہنچا تو اس سے پہلے کہ ایرانی لشکر سے اس کا سامنا ہو، ایرانی سردار رستم نے حضرت سعدؓ کو خط لکھا، فردوسی نے اس خط کا ذکر کیا ہے، اس خط میں جہاں رستم نے ایرانیوں کی عظمت و برتری کی ڈینگ ماری ہے وہاں عربوں کو طنز و ذم کے الفاظ سے یاد کیا ہے، وہ خط کے آغاز میں یزداں کی حمد و ثنا کے بعد اپنے بادشاہ پر درود و سلام بھیجتا ہے اور اسے تاج اور تخت و نگیں کے لیے زیبائی کا باعث قرار دیتا ہے پھر عربوں کی آمد کو ناپسندیدہ معاملہ کہہ کر ان کی جنگ پر آمادگی کو ایک غلط حرکت سمجھتا ہے، وہ حضرت سعدؓ سے خود ان کا اور ان کے "بادشاہ" کا نام و نشان پوچھتا ہے، اسکے بعد تند انداز میں جو سراسر تحقیر و تذلیل لیے ہوئے ہے، ان کے پھٹے پرانے لباس پر طعن و تشنیع کرتا ہے کہ تم (سعدؓ) خود بھی برہنہ ہو اور تمھارے لشکری بھی برہنہ ہیں، تم عرب لوگ صرف ایک روٹی کھا کر سیر ہو جاتے ہو دوسرے لفظوں میں بھوکے ہی رہتے ہو نہ تو تم کسی کمر و فر کے مالک ہو اور نہ کسی جاہ و حشم کے، پھر وہ ایران کے عظیم لشکر کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ تم عربوں کی آنکھوں میں شرم نہیں، تم عقل و دانش اور مہر و محبت سے عاری ہو اور اپنی اس ہیئت کذائی اور پست حالی کے باوصف ایران کے اس عظیم تخت و تاج کی آرزو کرتے ہوئے تمھیں ذرا بھی ندامت نہیں ہوتی۔ اپنی گدڑی سے پاؤں باہر نہ نکالو، تم (سعدؓ) اپنا کوئی دانا نمایندہ میرے پاس بھیجو تاکہ میں اپنا سوار بھجوا کر اپنے بادشاہ سے تمھارے لیے تمھارے حسبِ خواہش مال و متاع منگوا دوں، ہمارے عظیم بادشاہ سے

تمہارے لئے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے اگر اب بھی نہ سمجھ سکے تو پھر یہ سمجھ لو کہ تمہاری تقدیر میں کچھ نہیں ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ اور پرنے کی نہ سوچو ورنہ سوائے رنج وغم کے تمہیں کچھ میسر نہ آئیگا کیوں دنیا بھر کی نفریں لینے پر آمادہ ہو، باز آجاؤ . . . . . میرے اس نصیحت بھرے خط پر غور کرو اور اس سلسلے میں ہر قسم کی نادانی اور جہالت سے بچو۔

اہل ایران کو اپنی وسعتِ سلطنت عمدہ تہذیب و تمدن، خوشحالی و فارغ البالی، مال و دولت کی فراوانی اور اعلیٰ معیارِ زندگی پر بڑا ناز تھا،[1] اس سلسلے میں وہ اپنے مقابلے میں کسی اور کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایسی صورت میں ایسے لشکر کا انھیں چیلنج کرنا جس کے عام لشکری سے لے کر سردار سپاہ تک معمولی بلکہ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس اور جن کے پاس گھٹیا قسم کے اور معمولی ہتھیار ہوں، نہ صرف انتہائی تحیر و سرگشتگی کا باعث تھا، بلکہ بڑے ہی طیش اور غم و غصہ کا بھی سبب تھا، چنانچہ اس وسیع سلطنت کی "اعلیٰ و برتر" فوج کے عظیم سپہ سالار نے اس موقع پر جس انداز میں حضرت سعدؓ کے نام اپنے خط میں لشکرِ اسلام اور عربوں کو برا بھلا کہا ہے تو یہ ایک قدرتی امر تھا، اور فردوسی نے اس کی اس انداز میں تصویر کشی کرکے ایک ماہر، چابکدست اور ژرف نگاہ فنکار ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

به پیش آمد این ناپسندیده کار — به بیهوده این رنج و این کارزار
بمن بازگوی این که شاه تو کیست — چه مردی و این درا تو چیست؟
بنزد که جوئی همی دستگاه — برهنه سپهبد برهنه سپاه
بنانی تو سیری و هم گرسنه — نه پیل و نه تخت و نه بار و بنه
بایران ترا زندگانی بس است — که تاج و نگین بهر دیگر کس است

[1] انگریزی تصنیف (. . .) کے مؤلف نے جنگ قادسیہ کے ذکر میں ایک جگہ لکھا ہے۔ رستم سونے کے تخت پر بیٹھا ہے، سامنے تکیے اور فرش بھی سونے کے تاروں سے بنے ہوئے ہیں عجمی درباریوں کے سروں پر زرین تاج جگمگا رہے ہیں، دربار کے چاروں طرف ہاتھی کھڑے ہیں . . . . . " (اردو ترجمہ کتاب مذکور ص ۱۰۰)

شما را بدیده درون شرم نیست — ز راه خرد مهر و آزرم نیست
بدان چهر و آن مهر و آن رای و خوی — چنین تاج و تخت آیدت آرزوی؟
جهان به که اندازه جوئی همی — سخن بر گزافه نگوئی همی[1]

جب رستم کا قاصد حضرت سعدؓ کی خدمت میں پہنچتا ہے تو وہ اسے آہن و سیم و زر میں غرق دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں وہ ایرانیوں کو مردانگی سے عاری سمجھتے ہیں اور انھیں عورتوں کی طرح آرائش اور بناؤ سنگھار کرنے والے قرار دیتے ہیں، جو انداز رستم کا خط پیش کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے وہی انداز اور لہجہ یہاں بھی نظر آتا ہے، یعنی شاعر نے دونوں کرداروں کے ساتھ انصاف برتا ہے۔

ز دیبا نگویند مردان مرد — ز زر و ز سیم و ز خواب و ز خورد
شما را بمردانگی نیست کار — همان چون زنان رنگ و بوی و نگار
هنرتان بدیباست پیراستن — دگر نقش بام و در آراستن[2]

رستم حضرت سعدؓ کے ہاتھوں مارا جا چکا اور ایرانی فوج شکست کھا چکی ہے، ایرانی بادشاہ یزدگرد سوم تک یہ خبر فرخزاد کی وساطت سے پہنچی ہے، فرخزاد اسے کچھ مشورے بھی دیتا ہے جس سے بادشاہ اتفاق نہیں کرتا اور اس ضمن میں چند توجیہات سے کام لیتا ہے۔ فرخزاد بادشاہ کی اس گفتار پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ بد فطرت لوگوں سے بچنا ضروری ہے، پھر وہ مختلف تشبیہات و تمثیلات سے ایسے لوگوں کو ہجو و ذم کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق بادشاہ کو بد طینت افراد سے خود کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے، کیونکہ پوری کوشش کے باوصف انسان کی سرشت کو بدلا نہیں جا سکتا، فردوسی نے فرخزاد کے اس قول کو اپنے

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۸۲۶، ۸۲۷ [2] شاہنامہ چاپ کانپور جلد ۴ ص ۲۲۲

درخت کی تمثیل سے واضح کیا ہے جس کی جڑ کڑوی ہو اور اسے اگر باغ بہشت میں لگا دیا جائے، جوئے خلد سے اسے پانی دیا جائے اور اس کی جڑوں میں خالص مشک اور شہد ڈالا جائے تو بھی وہ کڑوا پھل ہی دے گا۔

بہ بدگوہران ہیچ ایمن مشو	کہ این را کی داستانست نو
کہ ہرچند بر گوہر افسون کنی	بکوشی کہ زو رنگ بیرون کنی
چو پروردگارش چنان آفرید	تو بر بند یزداں نیابی کلید
درختی کہ تلخست اورا سرشت	گرش در نشانی بباغ بہشت
گر از جوی خلدش بہنگام آب	بپای انگبیں ریزی و مشک ناب
سرانجام گوہر بکار آورد	ہمان میوۂ تلخ بار آورد[1]

مذکورہ گفتگو کے بعد یزدگرد بغداد سے عازم خراسان ہوتا ہے اور ایران کے بعض پہلوانوں مثلاً کنارنگ مرد اور ماہوی کو جو اس وقت خراسان میں ہیں، اپنے ایک پُر درد خط کے ذریعے اس شکست سے آگاہ کرتا ہے، اس خط میں وہ لشکر اسلام کا ذکر تحقیر آمیز لہجے میں کرتا ہے اور انھیں گالیوں سے نوازتا ہے۔

یہاں جس انداز میں فردوسی نے یزدگرد کے غیظ و غضب اور اضطراب کے حال احساسات و جذبات کی عکاسی کی ہے، وہ اس کی انسانی نفسیات میں کامل دسترس کا پتا دیتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک عظیم بادشاہ جو نسلاً بعد نسل بادشاہ ہے، اور جس کے پاس بہت بڑا اور پورے طور پر آراستہ و مسلح لشکر ہے، جب یہ سنتا ہے کہ ایک حقیر سا لشکر جس کا کوئی ماضی نہیں، جو شان و حشمت اور تخت سے عاری ہے، معمولی اور ٹوٹے پھوٹے ہتھیاروں کے ساتھ مقابلے پر اتر آیا، اور جنگ خوانی کر رہا ہے، تو وہ کیونکر ان لوگوں کی اس جرأت و

[1] خلاصہ شاہنامہ ص ۸۳۔

دل شکنی کو برداشت کر سکے گا، لہٰذا یزدگرد نے اس موقع پر جو کچھ کہا اور جس انداز میں اپنے احساسات کا اظہار کیا وہ ایک قدرتی امر تھا، اور فردوسی نے اسی انسانی فطرت کی ماہرانہ عکاسی کی ہے۔

یزدگرد اپنے خط میں اپنی بدبختی کا ذکر کرتے ہوئے عربوں کو مار خوار، شیطان نژاد کہہ کر انھیں عظمت، خزانے اور تخت سے عاری یعنی حقیر و بے وقعت قوم کا نام دیتا ہے۔ اس کے مطابق یہ لوگ عقل و دانش اور نام و ننگ سے بے بہرہ ہیں، وہ اسے ایران کی انتہائی بدبختی سمجھتا ہے کہ ایسی معمولی سی قوم ایران پر چڑھ دوڑی ہے، اور اسے تباہ کرنا چاہتی ہے، اسی حصہ میں وہ دو مشہور شعر ہیں، جن کی بنا پر بیچارے فردوسی کو رافضی اور خدا جانے کیا کیا کہا گیا ہے، یہ دو اشعار یزدگرد کے طیش و غضب کی بڑی جاندار تصویر پیش کرتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ عرب، یہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور سوسمار کا گوشت کھانے والے آج اتنے دلیر ہو گئے ہیں کہ عجم کی عظیم سلطنت کی آرزو کرنے لگے ہیں؟ لعنت ہو آسمان پر۔ ہاں جب فرومایہ لوگ بلند بخت ہو جاتے ہیں، تو صاحبان عز و جاہ کو ذلت و خواری گھیر لیتی ہے، اور ایسے ہی موقعوں پر بدی اور ظلم پھلنے پھولنے لگتے ہیں، اور نیکی غائب ہو جاتی ہے۔

ازین مار خوار اہرمن چہر چند	نہ گنج و نہ تخت و نہ نام بلند
ازین زاغ ساران بی آب و رنگ	نہ ہوش و نہ دانش نہ نام و ننگ
نہ فر و نہ نام و نہ تخت و نژاد	ہمی داد خواہند ایران بباد
ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجای رسید ست کار؟
کہ ملک عجم شان کنند آرزو	تفو باد بر چرخ گردان تفو[1]

[1] شاہنامہ چاپ کانپور (جلد چہارم) میں یہ دو شعر "ز شیر شتر ... الخ" "نامۂ رستم بسعد وقاص" کے تحت آئے ہیں اور دوسرا شعر اس طرح ہے: ع کہ تخت عجم را کنند آرزو ۔ تفو باد بر چرخ گردان تفو۔ (ص ۲۲۳۵)

بدین تخت شاہی نہادست روی — شُکم گرسنہ کام دیہیم جوی

شود خوار ہرکس کہ بود ارجمند — فرومایہ را بخت گردد بلند[1]

سَلم اور تُور اپنے باپ فریدون کے نام غصہ بھرا اور بے ادبانہ پیغام بھیجتے ہیں جب فریدون یہ پیغام سنتا ہے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے، اور وہ جواب میں انھیں طنز و تعریض اور مذمت سے پُر پیغام بھیجتا ہے، اس پیغام میں وہ انھیں ناپاک، بیہودہ اور مغز سے عاری شیطان قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر میری نصیحت تم پر کارگر نہ ہوگی تو اپنی عقل ہی سے کام لیتے، پھر وہ انھیں ایسا بے شرم کہتا ہے، جنھیں نہ تو خدا کا کوئی خوف ہو اور نہ عقل و خرد سے کوئی سروکار۔

بگو آن دو ناپاک بیہودہ را — دو اہرمن مغز پالودہ را

ز پند من از مغزتان شد تہی — چرا از خردتان نماند آگہی

ندارید شرم و نہ ترس از خدای — شما را ہمانا خرد نیست رای[2]

فردوسی نے جہاں کسی ایک کردار کی زبان سے کسی دوسرے کردار کی ہجو و مذمت میں کچھ کہا ہے، اس میں زیادہ تر ان دو باتوں پر زور دیا ہے کہ وہ عقل و خرد سے عاری اور خالی مغز انسان اور ننگ و شرم سے دور ہے، وہ کہیں ننگی گالی گلوج سے کام نہیں لیتا اگر اس کا کوئی کردار انتہائی غصے اور طیش کا بھی اظہار کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اپنے مخالف کو کتا، سانپ اور اسی قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے، اور یہ امر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ فردوسی عفت و شائستگی کا قائل ہے، اور انتہائی طیش کے موقع پر بھی عریانی اور فحش زبانی کو پسند نہیں کرتا، یہ الگ بات ہے کہ جگہ جگہ بے خرد، بے مغز

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۸۳۱ [2] ایضاً ص ۳۴۔

بے شرم اور ناپاک ایسے الفاظ کے بتکرار استعمال سے اشعار میں تاثیر و جاذبیت کم ہوگئی ہے بلکہ اس یکسانیت و یکرنگی نے اکثر اشعار کو پھیکا بنا دیا ہے، اس کی کچھ مثالیں پہلے گذر چکی ہیں اور چند ایک آگے آئیں گی، کاؤس ابلیس کے بہکانے پر آسمان کا رخ کرتا ہے، جب یہ خبر رستم، گیو اور طوس کو پہنچتی ہے تو وہ بہت بڑا لشکر لے کر روانہ ہوجاتے ہیں، ایک اور سردار گودرز اس سلسلے میں رستم سے بات چیت کرتا ہے بات چیت کے دوران کاؤس کو برا بھلا کہتا ہے، گویا اس حصہ میں یہی چند اشعار ہجو و طنز پر مشتمل ہیں، (باقی)

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر

معارف پریس اعظم گڈھ،

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	″ ″
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	″ ″

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،

سید اقبال احمد

وفیات

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

از ضیاء الدین اصلاحی،

۲۴/۲۵ فروری ۸۱ء کی درمیانی شب میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے رام پور میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ ممتاز اہل قلم، غالبیات کے ماہر اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر تھے، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے،

عرشی صاحب کا خاندانی تعلق افغانستان کے یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ حاجی خیل سے تھا، ان کے دادا مولانا اکبر علی خاں محدث پیشۂ آبا سپہگری چھوڑ کر علم وفضل کے کوچہ میں وارد ہوئے، ان کی علمی جانشینی ان کے ایک فرزند مولانا جعفر علی خاں کے حصہ میں آئی، اور سب سے چھوٹے صاحبزادے مختار علی خاں صاحب کی کم سنی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا، اس لئے یہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، مگر انہی کے صاحبزادے مولانا امتیاز علی خاں عرشی اس خاندان کے گل سرسبد ہوئے۔

امتیاز علی خانصاحب کی پیدائش ۸/دسمبر ۱۹۰۴ء کو ہوئی، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد عربی قواعد اور فارسی کی درسی کتابیں مدرسہ مطلع العلوم میں پڑھیں، اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا بڑا چرچا تھا، ہونہار طلبہ ملک کے

گوشہ گوشہ سے امتحانات دینے کے لیے لاہور جاتے تھے، عرشی صاحب نے ۱۹۲۳ء میں مولوی اور عالم کے امتحانات میں اول درجہ میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لئے اورنٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا، یہاں مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ اور مولانا عبد العزیز میمن جیسے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے استاذوں کا طوطی بول رہا تھا، مولانا سید طلحہ کا تعلق حضرت سید احمد شہید بریلوی کے دودمان عالی سے تھا، عرشی صاحب کا خاندان سید صاحبؒ کا معتقد اور رام پور میں "وہابیت" کے لئے بدنام تھا، اس لئے وہ مولانا طلحہ سے زیادہ مانوس اور قریب ہوئے اور مولانا بھی اُن پر خاص شفقت فرماتے تھے،

لاہور سے واپسی کے بعد انھوں نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں داخلہ لیا اور مولانا فضل حق رامپوری سے معقولات کا درس لیا جو امام معقولات . . . مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد خاص تھے، پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی میں انٹرنس کا امتحان دیا،

تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا تو ندوۃ العلماء لکھنؤ کی سفارت کی خدمت انجام دی، مگر جلد ہی اس سے دل برداشتہ ہوگئے، ڈاکٹر سید عبد العلی ناظم ندوۃ العلماء ان کے کام سے مطمئن تھے، انھوں نے باصرار روکا مگر عرشی صاحب نے استعفاء واپس نہیں لیا،

رامپور کا عظیم الشان کتبخانہ وہاں کے ریاستی حکمرانوں کی قابل فخر یادگار ہے، جب ۱۹۳۲ء میں عرشی صاحب کو اس کی نظامت سپرد کی گئی، تو پھر وہ اسی کے ہوکر رہ گئے، اور اس کی خدمت، ترقی اور توسیع کے لیے اپنی زندگی ہی وقف کردی، انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے کتبخانہ کی تزئین وآرائش اور جدید انداز پر اس کی ترتیب وتشکیل کرکے

اسے ایسا ادارہ بنا دیا جس سے ان کے بعد بھی لوگ مستفیض ہوتے رہیں گے، ان کو کتبخانہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے پھر کسی جانب نگاہ اٹھانا بھی پسند نہیں کیا، ایک دفعہ ڈھائی ہزار ماہوار پر ایران و افغانستان کی ثقافتی سفارت انھیں پیش کی گئی، جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا، اور کتبخانہ سے ملنے والے ڈھائی سو مشاہرہ ہی پر قانع رہے، وہ اس کے لئے اپنے مزاج کے خلاف دوسروں سے سوال کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، کرنل بشیر حسین زیدی صاحب مدتوں ریاست کے چیف منسٹر رہے، وہ فرماتے ہیں "جب سے میں چیف منسٹر ہوا ہوں کسی افسر شعبہ نے مجھے اتنا دق نہ کیا ہوگا، مجھ سے اتنے مطالبے نہ کئے ہوں گے جتنے عرشی صاحب نے، مگر سب کتبخانے کے لئے، اپنی ذات کے لئے ایک بھی نہیں۔"

اس ایثار و قربانی اور کتبخانہ کی بے لوث خدمت نے ان کو شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا، پورے ملک میں ان کا علمی وزن محسوس کیا جاتا تھا، ان کو بڑے بڑے اعزاز و انعام سے نوازا گیا، ساہتیہ اکاڈمی کے علاوہ پریسیڈنٹ اوارڈ بھی ملا، ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں یادگاری مجلے پیش کئے گئے، وہ ملک کی اہم علمی کانفرنسوں میں مدعو کئے گئے، اور بیرونِ ملک بھی تشریف لے گئے۔

غالبیات عرشی صاحب کی بحث و تحقیق کا خاص موضوع ہے، ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کرکے اردو کے محققین اور غالبیات کے ماہرین کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی اور تمام اصحاب علم و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس میں انھوں نے مرزا غالب کے ان خطوط کو جمع کیا تھا، جو نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین نواب کلب علی خان وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے، عرشی صاحب کے مبسوط مقدمہ اور حواشی نے غالب کے خطوط میں چار چاند لگا دیے ہیں، "انتخاب غالب" کی اشاعت بھی ان کا اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ ہے،

غالب نے ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کی فرمایش پر اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب کیا تھا جو عرشی صاحب کے مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا، فرہنگ غالب میں مختلف زبانوں کے لفظوں کی وہ تشریحات درج ہیں، جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی تھیں، یہ ۱۹۴۷ء میں چھپی، ۱۹۵۵ء میں انھوں نے غالب کا تمام اردو کلام شائع کرکے ان کے قدردانوں کو بیش قیمت علمی سوغات دی، یہی دیوان غالب نسخہ عرشی کہلاتا ہے، اس میں غالب کے تقریباً تمام اردو اشعار آگئے ہیں، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) گنجینۂ معنی (۲) نوائے سروش (۳) یادگار نالہ،

وہ زندگی بھر غالب کے متعلق تحقیق و جستجو کرتے رہے اور ان پر درجنوں مضامین بھی لکھے، اُن کی غالب سے متعلق متعدد کتابیں اور تحریریں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں،

عرشی صاحب کا موضوع غالب ہی تک محدود نہ تھا، وہ شعر و ادب، سیر و تراجم، تاریخ و مذہب اور فلسفہ ہر چیز میں برق تھے، اور انکا شہب قلم اردو، فارسی اور عربی میں رواں دواں رہتا تھا، عربی میں ان کا اہم باشان کارنامہ امام سفیان ثوری کی تفسیر کی دریافت و اشاعت ہے، اس کے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی سے ان کی غیر معمولی کد و کاوش کا پتہ چلتا ہے، اس کے علاوہ بعض عربی دواوین اور ابو عبید قاسم بن سلام ہروی صاحب کتاب الاموال (م ۲۲۴ھ) کا رسالہ اجناس بھی انھوں نے ایڈٹ کرکے شائع کیا تھا، فارسی میں وقائع عالم شاہی، تاریخ محمدی اور تاریخ اکبری وغیرہ کو منظر عالم پر لانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، ان کے تحقیقی کاموں میں ایک اہم چیز "نادرات شاہی" ہے، یہ خاندان مغلیہ کے آخری دور کے بادشاہ جلال الدین شاہ عالم ثانی کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے، اسکی اشاعت سے پہلی دفعہ لوگوں کو اس مظلوم بادشاہ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کا علم ہوا،

عرشی صاحب نے مقدمہ میں اس کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر مفید گفتگو کی ہے ،

آخر میں رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی انگریزی میں فہرست مرتب کر کے چھ جلدوں میں شایع کیا، انکی غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد بیشمار ہے، طالب علمی کے زمانہ میں جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو وہاں کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی کی فرمایش پر انہوں نے ایف۔ اے اور بی۔ اے کے کورس کی عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا تھا، اسی سلسلہ میں ان کو حضرت عمرؓ کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال بھی جمع کرنے کا خیال ہوا، اس کے لئے زندگی بھر مواد فراہم کرتے رہے مگر یہ کتاب نا مکمل رہ گئی ،

شعر بھی موزوں کر لیتے تھے، عرشی تخلص تھا لیکن شعر و سخن میں اُن کا ذوق اتنا لطیف اور معیار اس قدر بلند تھا کہ اپنا کلام پسند نہ آتا تھا، اور وہ اسے اساتذہ کے کلام سے بہت کمتر سمجھتے تھے، اس لئے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آنے دی ،

مخطوطات کی تحقیق و دریافت اُن کی تلاش و جستجو اور انکو محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شایع کرنا عرشی صاحب کا خاص امتیاز ہے ، وہ متن کی تصیحح و تحشیہ کے کام سے اُس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جبتک کہ انکے تمام نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیتے، اسکے لیے ان جگہوں کا سفر کرتے تھے جہاں انکے نسخے موجود ہوتے یا انکی نقلیں مہیا کرتے انکی تحریر میں عالمانہ وقار و سنجیدگی کے ساتھ ہی سادگی، لینت، سلامت روی اور دلآویزی ہوتی تھی '

انکی شخصیت باوقار تھی اور وہ بڑے وجیہ و شکیل اور جامہ زیب تھے، چہرہ بشرہ ہر چیز سے متانت اور سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی، راقم کو دار المصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا، وہ گفتگو بہت شایستہ، نرم اور شیریں انداز میں کرتے تھے، خالص علمی گفتگو اس قدر پُر لطف اور دلچسپ انداز میں کرتے کہ سننے والے کو اکتاہٹ نہ ہوتی، ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، ان کی نفاست اور نظافت پسندی کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے، جو بہت اچھی اور عمدہ چھپتی تھیں ،

عرشی صاحب ممتاز عالم و محقق تھے لیکن وہ نہ دوسروں کو اپنے علم و کمال سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے اور نہ خود کسی سے مرعوب ہوتے تھے، رام پور کی لائبریری میں اہل علم کے علاوہ اکثر وزراء، سرکاری حکام اور عمائد بھی آتے رہتے تھے، مگر وہ ان سے اس طرح ملتے کہ علم کی آن بان میں فرق نہ آنے دیتے بلکہ آنے والے خود ان کے علمی وقار اور ذاتی وجاہت و شرافت سے متاثر ہوتے تھے، وہ بہت متوازن اور عالی ظرف تھے، بڑے بڑے انعام و اعزاز پاکر بھی نہ آپے سے باہر ہوئے اور نہ کسی قسم کی رعونت اور پندار میں مبتلا ہوئے ۔

ان کی زندگی بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے بری تھی، اُن میں خود نمائی اور خود ستائی کا مرض نہ تھا، کبھی ایسی بات نہ کہتے جس میں اظہار فضیلت کا شائبہ ہوتا، اپنے علمی کاموں کی تعریف و تحسین اور دوسروں کی شکایت و مذمت سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے، خوردوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمسروں کے قابل قدر کاموں کی داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کرنے میں ان کو بہت لذت ملتی تھی کتبخانہ سے استفادہ کرنے کے لیے جو لوگ آتے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے، ان کا علم و مطالعہ بہت وسیع تھا، اسلئے ہر ایک کے مطلب کی کتابوں کی نشاندہی کر کے اسکی اکثر مشکلات حل کر دیتے اور اسکو متعدد کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیتے۔

انکو دار المصنفین سے بڑا تعلق تھا اسکے علمی کاموں کے مداح اور قدردان تھے، معارف میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت بھی تھی، ماہنامہ ریاض کراچی کے اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں انکے خطوط "مکاتیب سلیمان" کے عنوان سے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کئے تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے زمانہ میں دار المصنفین کی گولڈن جبلی میں شرکت کیلئے رام پور سے تشریف لے گئے، جناب مالک رام صاحب نے انکی اسّیویں سالگرہ کے موقع پر انکو ایک یادگاری مجلہ پیش کیا تھا، اس میں موجودہ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کا عرشی صاحب پر ایک پُر مغز مقالہ بھی شامل ہے ،

عرشی صاحب کا اوڑھنا بچھونا علم تھا اور بقول شیخ سعدی ؎ پے علم چوں شمع باید گداخت کے مصداق تھے، اب انکی طرح خاموشی اور سچی لگن کے ساتھ صلہ و ستایش کی تمنا کئے بغیر علم کی خدمت کرنے والے کم یاب ہیں، اللہ تعالیٰ انکو عالم آخرت کے بلند مدارج عطا فرمائے آمین !

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث الجزء الاول } مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن، تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۰۸، قیمت ۱۰ روپیہ، پتہ حافظ ہاؤس میلاپورن اسٹریٹ، مدراس ۱۴

یہ لائق مصنف کے اُن خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے کالی کٹ یونیورسٹی کی دعوت پر جدید عربی ادب کے موضوع پر وہاں عربی میں دئے تھے، اس سلسلہ میں ان کو مصر، شام، لبنان، عراق اور مہجر کے مشہور اصحاب کمال کے متعلق اظہار خیال کا موقع ملا تھا، زیر نظر کتاب ان خطبات کی پہلی جلد ہے، اس میں تقریباً تیس ممتاز اصحابِ شعر و ادب کے سوانحی خاکے درج ہیں، شروع میں مشرق وسطیٰ کے دو صدیوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں دولت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد عربی ملکوں پر مغلوں کے تسلط، آل عثمان کے تخت و تاج کے مالک ہوتے، خلافت اسلامیہ کے قیام، مغربی ممالک کی سازشوں اور عربوں کے ان کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوئے وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، پھر عربی طباعت و صحافت کے متعلق ضروری مفید معلومات قلمبند کیے ہیں، اس ضمن میں متعدد مشہور اخباروں، رسالوں اور ان کے اڈیٹروں کا تذکرہ بھی ہے، اس کتاب میں جن مصنفین و شعراء کے حالات و کمالات کی مصوری کی گئی ہے، ان میں کچھ قابل ذکر نام یہ ہیں، رفاعہ رافع طہطاوی، علی پاشا مبارک، سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، شیخ محمد رشید رضا، عبد الرحمن کواکبی، جرجی زیدان، مصطفیٰ منفلوطی، شیخ اسماعیل صبری، احمد شوقی، حافظ ابراہیم، خلیل مطران، امیر شکیب ارسلان وغیرہ، مصنف نے ان لوگوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی

ان کی خدمات اجمالاً تحریر کی ہیں، اور صرف مسلمان اربابِ قلم کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ عیسائی ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، وہ کہنہ مشق مصنف ہیں، انھوں نے کئی برس تک دار المصنفین میں رہ کر تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی، پھر مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی و اردو کے صدر بھی رہے، ان کو اردو ہی کی طرح فارسی اور عربی لکھنے کا بھی اچھا ملکہ ہے، اس کتاب سے ان کے اچھے تصنیفی سلیقہ اور عربی زبان پر قدرت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے، امید ہے کہ عربی زبان و ادب کا ذوق رکھنے والے ان کی محنت کی قدر کریں گے، اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا،

محدثین کی قوتِ حفظ :- مرتبہ مولوی محمد ابوبکر غازی پوری صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۲ روپیہ، پتہ المکتبۃ الاثریہ، قاسمی منزل سید واڑہ، غازی پور،

احادیث کے جمع و تدوین اور ضبط و تحریر کا عظیم الشان کام محدثین کی مقدس جماعت کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے، محدثین کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت کی قوت بے مثال تھی، زیر نظر کتاب میں محدثین کے حفظ و ضبط کے حیرت انگیز واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اس کا سلسلہ صحابۂ کرام و تابعین عظام کے دور سے شروع ہو کر اس صدی کے نامور محدث مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم پر ختم ہوا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے لئے مفید اور کار آمد ہے، مگر بعض محدثین کے حفظ کے واقعات نہیں دئے گئے ہیں، اور بعض کے احادیث کے بجائے اشعار وغیرہ کے حفظ کا ذکر ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "ان کے علم اور قوتِ حفظ کو جاننے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ انھوں نے سات سو جلدوں میں قرآن کی تفسیر تالیف کی تھی" (ص ۱۳۱) حالانکہ یہ صرف وسعت علم کی دلیل ہے، محدثین کے طبقہ میں واقدی اور ابن جریر کا ذکر بے محل ہے، اول الذکر سیر و مغازی کے عالم اور موخر الذکر مورخ کی حیثیت سے مشہور ہیں،

مصنف نے امام ابوحنیفہؒ کا تابعی ہونا مدلل طور پر ثابت کیا ہے مگر خلف بن ایوب کا جو قول نقل کیا ہے (ص ۳۶) اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، عربی عبارتوں کا لفظی ترجمہ کرنے اور بعض ثقیل وناما نوس عربی الفاظ استعمال کرنے سے تحریر کی روانی وسلاست میں کمی آگئی ہے،

عرفان محبت :- از مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۸۰، قیمت للعہ ۱۲ روپے، پتہ - مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنو

مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی کی ذات شریعت وطریقت کی جامع، رشد وہدایت کا منبع اور طالبین سلوک کا مرجع ہے، ان کی صہبائے معرفت کے اس وقت مشرقی یوپی کے لوگ خاص طور لذت شناس ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو شعر وسخن کا بھی اچھا اور ستھرا ذوق عطا کیا ہے، وہ اپنی محفلِ ارشاد وہدایت کو اپنے پُرسوز کلام سے پراثر اور پرکیف بنا دیتے ہیں، اب ان کے قدر دانوں اور مسترشدین نے ان کی دکان معرفت سے دردمندوں کے لیے دوائے دل کا سامان اُن کا مجموعہ کلام شائع کرکے کیا ہے، یہ زلف وگیسو اور گل وبلبل کی حکایت اور ہجر ووصال کی داستان نہیں ہے بلکہ صدائے ربانی اور نغمۂ لاہوتی ہے،

اس لئے یہ غزل سرائی ہے ہے اشارہ کچھ ان کی جانب سے
کرم ہے کرم خاص احمد پہ ان کا کہ جلوہ اسے اپنا دکھلا رہے ہیں

یہ ایک صاحبِ دل کا کلام ہے جس میں عشق کی مستی وسرشاری، محبت کی گرمی وشعلہ نوائی، جذبات کی لطافت وپاکیزگی اور خیالات کی معنویت وگہرائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ قلبی واردات وباطنی کیفیات کا ترجمان اور بادہ معرفت کا ایک چھلکتا ہوا جام ہے ....

.... جو تمامتر دل کی آواز معلوم ہوتا ہے،

اس میں راہ سلوک کے ہر مرحلہ کے نشانات اور شیخِ طریقت کی صحبت، پیر مےخانہ کی بزم اور

چشم ساقی کے فیض کے بہت دلکش جلوے اور دلآویز مرقعے ملتے ہیں، صاحب کلام کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، وہ بتاتے ہیں کہ اس منزل پر پہنچنے کے بعد تمام حقائق منکشف ہوجاتے ہیں، اور ہر سو محبوب ہی کے جلوے نظر آتے ہیں، سچا عاشق دام محبت سے رہائی کا آرزو مند نہیں ہوتا، بلکہ آتش عشق ومحبت میں مر مر کے جیتا اور بسمل کی طرح تڑپتا ہے، وہ محبوب کی غلامی پر فخر کرتا ہے، اور اس میں اسکو سلطانی وفرمانروائی کا لطف ملتا ہے، اس کا احساسِ سود وزیاں مٹ جاتا ہے، اور وہ فرقت میں وصل اور ہجر میں حضور کی لذت سے سرشار رہتا ہے، یہ مجموعہ عشق ومحبت کے ان ہی حقائق واسرار اور ان کی کیفیتوں اور لذتوں کی شرح وتفسیر اور لاہوتی ترانوں اور سرمدی نغموں سے معمور ہے، مولانا کا کمال یہ ہے کہ عشق ومستی اور جذب وکیف کے اس عالم میں بھی ان کا ہوش قائم رہتا ہے، اور خم کے خم پی کر بھی ان کی گرفت دل اور جذبات پر باقی رہتی ہے، اس لئے نقل سے بےگانہ اور عقل کے پیچھے دیوانہ نہیں ہوتے اور بندگی کی لذت کے مقابلہ میں حال وقال کی لذتوں کو ہیچ خیال کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو توحید ورسالت کا مرتبہ شناس بننے کی دعوت اور اسوۂ محمدیؐ اختیار کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں، انھوں نے مرزا غالب وغیرہ کے بعض اشعار میں اپنے ذوق کے مطابق اصلاح وترمیم کی ہے، اس کے کچھ نمونے مجموعہ کے آخر میں دئے گئے ہیں، انکے بعض اشعار خالص فنی حیثیت سے بھی کم درجہ کے نہیں ہیں وجدانی کوائف اور عارفانہ حقائق سے معمور اس کلام کو پڑھکر دل کی دنیا بدل جاتی ہے، اور وہ انوار وتجلیات سے معمور ہو جاتی ہے۔

ایک معلم کی سرگذشت، معاصرین کے خطوط نامہ ہائے دوست } مرتبہ جناب بشر علی صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۱۲۴ و ۱۱۲ و ۱۶۲ قیمت ہر ایک کی دس روپیے، پتہ - سلیم بلبشرار دو سوسائٹی (رجسٹرڈ) گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں، یو۔ پی

جناب بشیر علی صدیقی کی زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت و ترقی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف رہی ہے، درس و تدریس انکا پیشہ تھا اور وہ ایک فعال اور عملی شخص ہیں، بڑھاپے میں بھی انکے جوش عمل اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی ہے، ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہونے کے بعد سلیم بشیر اردو میڈیم اسکول تعلیم بالغان اور اردو ٹیچرس سرٹیفکیٹ کے نصاب کی ٹریننگ کی نگرانی وغیرہ کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو انکی قوت عمل اور ذوق علم و تعلیم کا ثبوت ہے، انکو شروع ہی سے تحریر و تالیف کا ذوق تھا معلمی کے دور میں بھی انکا تحریری سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا اور یہ اب بھی جاری ہے، انکی تصنیفات زیادہ ضخیم نہ ہونے کے باوجود بقامت کہتر و بقیمت بہتر ہوتی ہیں، پہلی کتاب میں اپنی طویل تعلیمی زندگی کی سرگزشت تحریر کی ہے اس میں انھوں نے شعبۂ تعلیم سے اپنی اولین وابستگی کے وقت سے سبکدوش ہونے تک کے تمام حالات، واقعات، اشغال، معمولات اور تجربات قلمبند کئے ہیں، اسلئے اسکی حیثیت آپ بیتی کی ہوگئی ہے، انکی تعلیمی زندگی کا آغاز گورنمنٹ انٹر کالج میں معلم کی حیثیت سے ہوا تھا پھر وہ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور آخر میں گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے، انکی ملازمت کی زندگی مختلف اسکولوں اور مختلف جگہوں میں بسر ہوئی، اس دوران میں طلبہ، اساتذہ، پرنسپل اور انسپکٹر کے علاوہ مختلف قسم کے اشخاص و افراد سے ان کا سابقہ پڑا، تدریسی کاموں کے علاوہ طلبہ کے تحریری و تقریری مقابلے اور سالانہ مشاعرے کرائے، کالج میگزین کی نگرانی کی، علاقائی اور ڈسٹرکٹ ریلی وغیرہ اسکولی زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں پیش پیش رہے، اس کتاب میں ان سب کا بے تکلفی کے ساتھ دلچسپ انداز میں ذکر ہے، اس سے گذشتہ نصف صدی کے ابتدائی و ثانوی تعلیم و تدریس کے شعبہ کے اتار چڑھاؤ اور مصنف کے درسی و تعلیمی تجربات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری اور تیسری کتاب مرتب کے ساٹھ سے زیادہ معاصرین اور احباب کے خطوط کا مجموعہ ہے، جن خطوط میں کسی استفسار کا ذکر ہے انکا جواب بھی دیدیا ہے، اور ہر ہر خط کا پس منظر اور اسکے مندرجات کی وضاحت بھی کر دی ہے، یہ تینوں کتابیں ایک تجربہ کار معلم اور اردو زبان کے شیدائی کی تصنیف ہونے کی بنا پر گوناگوں فوائد پر مشتمل ہیں، امید ہے معلمین و متعلمین کے حلقہ میں ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد